سرا تاریخ کے آئینے میں

محمد صبغتہ اللہ

صدر شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج سیوا
مُسکور (ضلع)

سرا تاریخ کے آئینے میں

محمد صبغتہ اللہ

صدر شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج سرا
ٹمکور (ضلع)

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

به اعانت کرناٹک اردو اکیڈمی بنگلور

سال اشاعت : جولائی ۱۹۸۶ء تعداد ایک ہزار

کتابت محمد ہدایت اللہ

ناشر اردو لائبریری سنٹر
نمبر ۲۷ سٹی مارکیٹ
بنگلور

قیمت دس روپے

ضحاک (ڈرامہ) از: ڈاکٹر محمد حسن

ترجمہ بزبان کنڑا محمد صبغۃ اللہ

ملنے کا پتہ

اردو لائبریری سنٹر نمبر ۲۷ سٹی مارکٹ
بنگلور

انتساب

ڈاکٹر خضر علی خان صاحب مرحوم

کے نام

جن کی شفقتیں ہمیشہ یاد رہیں گی

نقشہ سرا

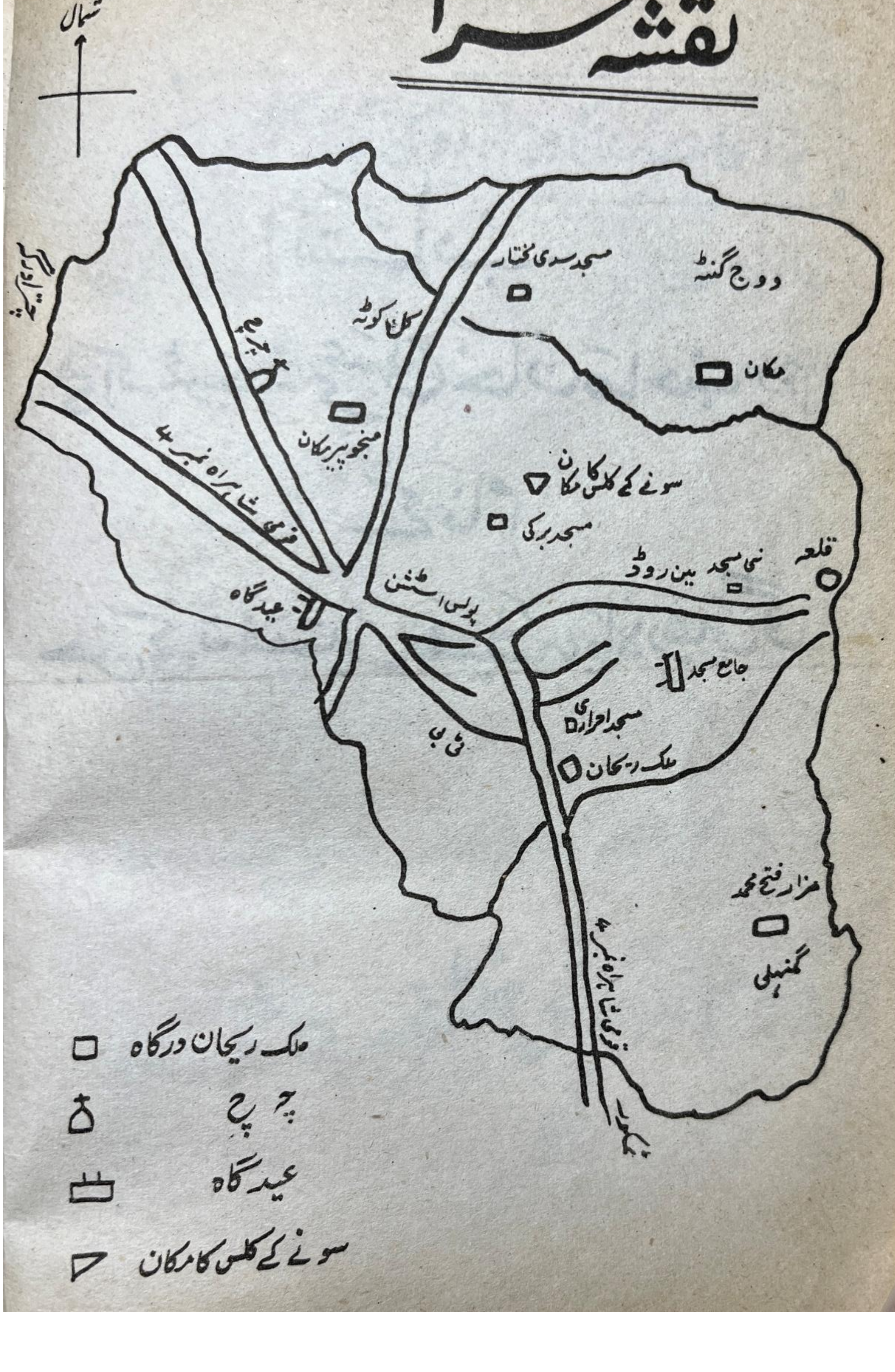
شمال
مسجد سدی مختار
دوج گنٹہ
کل کوٹہ
چرچ
مکان
منجو پیر مکان
سونے کے کلس مکان
مسجد برکی
قلعہ
نئی مسجد
مین روڈ
پولس اسٹیشن
عیدگاہ
جامع مسجد
مسجد احراری
ملک ریحان
ٹی بی
مزار فتح محمد
گمنہلی
ملک ریحان درگاہ
چرچ
عیدگاہ
سونے کے کلس کا مکان

ترتیب

۱۔ عرض حال ۶

۲۔ مقدمہ ۸

۳۔ پس منظر ۱۲

۴۔ تاریخ سرا ۱۹

۵۔ قدیم عمارات سرا ۴۶

۶۔ مقابر اولیائے سرا ۶۷

۷۔ تعلیمی ادارے ۹۳

۸۔ دیگر ادارے ۹۴

۹۔ عام معلومات ۹۵

۱۰۔ کتابیات ۹۶

عرضِ حال

تعلیم سے فراغت کے بعد سرا میں علمی خدمت کا موقع فراہم ہوا۔ شہر سرا کے آثارِ قدیمہ دیکھنے کے بعد یہ ارادہ ہوا کہ اس شہر کے تاریخی حالات کو جمع کرکے ترتیب دیا جائے۔ سرا کالج میں میرے تقرر کی بات سن کر استادِ محترم جناب خضر علی خاں صاحب قبلہ مرحوم بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ آپ ایک تاریخی شہر میں قیام کرنے جا رہے ہیں جہاں تقریباً تین سو سال تک عادل شاہی مغل، مرہٹہ اور سلطنت خداداد نے حکومت کی ہے۔ وہاں کے آثارِ قدیمہ اس بات کا ثبوت ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ وہاں کے تاریخی حالات کا جائزہ لیں اور شائع کریں یہ اہم کام ہوگا۔ خدا مرحوم کو غریقِ رحمت کرے آپکے مشورے نے میرے ارادوں کو تقویت پہنچائی اور اس کام میں جٹ گیا آج اگر وہ زندہ رہتے تو اس کام کو دیکھ کر پھولے نہ سماتے۔

استادِ محترم جناب میر محمود حسین صاحب قبلہ سے بھی بذریعہ خط وکتابت مشورہ کرتا رہا کیونکہ نہ صرف آپ میرے استاد ہی نہیں محقق بھی ہیں دورانِ تعلیم آپ سرا کا بھی تذکرہ کیا کرتے تھے۔ اس بارے میں آپ نے نہایت مفید مشورے دیئے آپکی دو کتابیں مقالاتِ محمود اور ریاست میسور کے عربی فارسی اور اُردو کتبے اس تاریخی تذکرہ میں رہنمائی کرتے رہے جس کا میں ممنون ہوں۔

خارجی تاریخی شواہد جیسے مقابر، مساجد، قلعے اور کتبے وغیرہ آسانی سے مل جاتے ہیں لیکن داخلی شواہد جیسے دستاویزیں، مخطوطے، شجرے وغیرہ کا حاصل کرنا دشوار امر ہے۔ پھر بھی عمائدینِ شہر اور اساتذہ اکرام نے میری دلچسپی کو دیکھتے ہوئے میرا پورا ساتھ دیا جس کی وجہ آج یہ کتاب ہدیۂ ناظرین ہے۔

سرا کے تاریخی حالات کے تحقیقات کے دوران بہت سی باتیں سننے میں آئیں مخطوطات کے بارے میں جب بھی کچھ پتہ چلتا صاحبِ کتاب کے پاس جانا ہوتا۔ کچھ احباب ایسی کتابوں کو دینے سے احتراز کرتے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جو باتیں ہمیں معلوم نہ ہوسکیں باہر آجانے سے نہ جانے

کیا انجام ہو. کسی نے بتایا کہ ان قلمی کتابوں کو ناقدری سے بچانے کے لئے کنوؤں یا تالابوں میں ڈال دیا گیا. کسی نے پرانی قبروں میں دفن کر دیا یا جلا دی گئیں. کتابوں کو ناقدری سے بچانے کے لئے ایسے ایسے طریقے اختیار کئے گئے کہ ایسا بیش قیمت خزانہ ہمیشہ کے لئے گم ہو گیا. کئی احباب ایسے بھی ہیں جن کے پاس آبا و اجداد کا علمی خزانہ موجود ہے لیکن وہ ان کتابوں کو ہاتھ لگانے نہیں دیتے جس سے یہ نوادرات یوں ہی پڑے ہوئے ہیں. ان کا خوف بھی بجا ہے کیونکہ ایسی کئی کتابیں لوگوں نے عاریتاً ان سے لیں اور نہیں لوٹائیں. زیر اکس کے ذریعہ مخطوطات کی نقلیں آسانی سے دستیاب ہو گئیں اس لئے میں ان احباب کا ممنون ہوں جنہوں نے اپنے پاس کے مخطوطات عنایت کئے اور اس طرح کئی شجرے پروانے حاصل ہو سکے

کتاب کی اشاعت میں میرے بزرگ مہربان محترمی ابو تراب خطائی صاحب ضامن کے زرین مشورے شامل نہ ہوتے تو اس کتاب کی اشاعت میں اور تاخیر ہو جاتی. کرناٹک اردو اکیڈمی والوں نے اس کتاب کی قدر افزائی کی اور اشاعت کے لئے مالی جزوی امداد بھی عطا کی جس سے آج یہ تاریخ کا کچھ حصہ سامنے آسکا. میں اکیڈمی اور خطائی صاحب کا مشکور ہوں

آخر میں اہل سرا سے میری اپیل ہے کہ اگر ان کے پاس کسی بھی قسم کے مخطوطات، پروانے، یا کوئی بھی تاریخی دستاویزیں ہوں تو انہیں تلف ہونے سے بچالیں اور ان تبرکات کو کسی قدر شناس ادیب یا کسی ادارے کے حوالے کر دیں جہاں وہ محفوظ بھی رہ سکیں اور ان پر تحقیقات ہو سکیں. انشاء اللہ تعالیٰ اس سلسلہ میں مزید مواد دستیاب ہوا تو آئندہ ایڈیشن میں اسکا بھرپور فائدہ اٹھایا جائے گا.

محمد صبغتہ اللہ

صدر شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج سرا

ٹمکور (ضلع)

مقدمہ

تمام فنون میں تاریخ نویسی ایک بہت ہی جانکاہ اور دشوار ترین امر ہے کیونکہ ایک ایک جملہ لکھنے سے پہلے اس کی تحقیق ضروری ہوتی ہے کئی تاریخیں ایسی بھی پائی جاتی ہیں جن میں اپنے یا قوم کے مفاد کے پیش نظر واقعات کو توڑ مروڑ کر یا مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے اور ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں تاریخ کا مطالعہ کرنے کے لئے واقعات اور سنین کا تقابلی جائزہ لینا ضروری ہے ۔ جو واقعات ایک تاریخ میں پائے جائیں اور دوسری تاریخ میں نہ ملیں یا برعکس ہوں تو ایسے محل بحث تاریخی واقعات کو نظر انداز کر دینا بہتر ہوتا ہے کیونکہ قاری کا ذہن ایک سادے کاغذ کے مانند ہوتا ہے اور صحیح یا غلط روایت اس کے ذہن پر ایسے مرتسم ہو جاتے ہیں کہ اسے ازالہ کرنے کے لئے بہت دشواری پیش آتی ہے۔ سنین کے معاملے میں بھی اندازے لگانا صحیح نہیں بلکہ جو واقعات تاریخی لحاظ سے درست ہوں انہیں کا ذکر کرنا چاہیئے

شہر سرا کو جنوب میں صدیوں سے مرکزیت حاصل ہوئی ہے۔ سقوط سلطنت خدا داد کے بعد سے اس کی اہمیت گھٹ کر محض ایک تعلقہ کی رہ

گئی ہے۔ سرا بیجاپوری سلطنت کا ایک صوبہ بنا رہا۔ اورنگ زیب نے جب عادل شاہی سلطنت کا خاتمہ کر دیا تو اس نے بھی سرا کی مرکزیت کو قائم رکھا اور سرا دکن کا ایک مشہور صوبہ بنا رہا۔ مرہٹوں نے جب سرا فتح کیا تو ان کے گورنروں کی عملداری یہاں قائم رہی۔ سلطنت خداداد کی قلم رو میں جب یہ علاقہ شامل ہو گیا تو نواب حیدر علی خاں اور ٹیپو سلطان کے عامل صوبۂ سرا کے نظم و نسق کو سنبھالتے رہے

یہ تاریخ اوائل سترھویں صدی سے بیسویں صدی کے اختتام پر محیط ہے ظاہر ہے یہ سرا کی پوری تاریخ ہرگز نہیں ہو سکتی اس کے لئے ضخیم جلدوں کی ضرورت پڑے گی۔ یہاں مکرمی محمد صبغتہ اللہ صاحب نے جستہ جستہ تاریخی واقعات بیان کئے ہیں اور جو کچھ انہیں مواد فراہم ہو سکا ہے اور جو عمارتیں اور ان کی تاریخی اہمیت سے وہ واقف ہو سکے ہیں انہوں نے پیش کیا ہے۔

سرا اگر ایک طرف سیاسی ریشہ دوانیوں کا آماجگاہ بنا رہا اور کئی حکومتوں کے زیر عنان رہا اس سے پرے اور الگ تھلگ عوام کی ہدایت کے لئے ایک طبقہ سرگرم عمل رہا (یعنے اولیاء اکرام کا گروہ) ان اولیائے عظام نے رشد و ہدایت کی تلقین کی۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ جس شخصیت کا عرس ہر سال تزک و احتشام کے ساتھ منایا جاتا ہے وہ حضرت ملک ریحان ہیں اگرچہ وہ کئی سال تک سرا کے صوبہ دار بنے رہے مگر ان کے زہد و تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ لوگ انہیں پاکباز متقی پابند شرع بزرگ سمجھنے کے علاوہ، ایک ولی بھی مانتے ہیں۔ جیسا کہ آج بھی حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ کی عظمت کا نقش لوگوں کے دلوں پر قائم ہے اور ذوالقعدہ کے اواخر میں ان کا عرس بڑی عقیدت کے ساتھ منایا جاتا ہے جن کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ مسجد اعلیٰ میں جب پہلی مرتبہ اذان کی آواز گونجی تو یہ مشورہ ہوا کہ وہی

شخص امام بنے جو صاحب ترتیب ہو جب علماء کے جھگڑے سے کوئی شخص آگے نہ بڑھا تو سلطان ٹیپو یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے کہ بحمد اللہ میں صاحب ترتیب ہوں۔

حضرت ملک ریحان کے علاوہ جن ارباب تصوف نے شہر سرا کو زینت بخشی ان میں حضرت فرید اللہ شاہ حسینی، عارف شاہ قادری حضرت میجو پیر شاہ ابو الحسن قادری وغیرہ مشہور ہیں جنہوں نے اپنے رشد و ہدایت سے عوام کو سیدھی راہ دکھائی۔ تقریباً ہر سلسلۂ ولایت کے بزرگ یہاں تشریف فرما تھے۔

دکھنی زبان قطب شاہی اور عادل شاہی ادوار میں عوام کی زبان بن چکی تھی اور ظاہر ہے جب تک کسی زبان کا عوام میں رواج نہ ہو اس زبان میں تصنیف و تالیف کا بہت کم کام ہوتا ہے۔ درج بالا دونوں حکومتوں میں بھی سرکاری طور پر فارسی زبان جاری رہی۔ مگر عوام کا ایک بڑا حصّہ اسے پڑھنے اور سمجھنے سے قاصر تھا۔ شاہان وقت بھی دکھنی زبان کی شیرینی اور لطافت سے فیض یاب تھے۔ کئی ایک بادشاہوں نے اس زبان میں شاعری کی جو بھی مواد دکھنی زبان کا ملتا ہے اس میں بیشتر حصّہ سلاطین گولکنڈہ و بیجاپور اور ان کے زمانے کے مشہور شاعر اور نثر نگاروں کا ہے۔ سرا بھی چونکہ بیجاپوری عملداری میں تھا اس لئے یہاں بھی دکھنی زبان کو پھلنے پھولنے اور فروغ پانے کا موقع ملا۔ ارباب اہل قلم میں حضرت عارف شاہ قادری اہم ہیں جو حضرت شاہ صدر الدین کے خلیفہ ہیں جن کا مزار نلمنگل میں ہے جو بنگلور سے ۲۵ کیلو میٹر مغرب کی طرف ٹمکور بنگلور شاہراہ پر واقع ہے۔ شاہ صدر الدین خود بھی صاحب تصنیف بزرگ تھے۔ ان کی ایماء پر عارف شاہ قادری نے

بھی تصنیف و تالیف کا کام جاری رکھا۔ انہوں نے کئی مثنویاں بھی لکھی ہیں ان کے علاوہ حضرت فرید اللہ شاہ حسینی اور حضرت منجو پیر نے بھی کئی رسالے تصوف پر تصنیف کئے تھے مگر اب تک وہ ہماری نظر سے نہیں گذرے جیسے جیسے تحقیقات کا دائرہ وسیع ہوگا قدیم کتابیں جو گوشۂ گمنامی میں پڑی ہوئیں ہیں سامنے آئیں گی۔

چونکہ اس کتاب میں اولیائے کرام کی تصنیفات کا ذکر کیا گیا ہے جناب صبغتہ اللہ صاحب کا ارادہ ہے کہ شہر سرا کے ان بزرگوں کے مخطوطات جمع کرکے ترتیب دیں جس میں ان مقتدر ہستیوں کے ادبی کارناموں پر روشنی پڑ سکے۔

جناب صبغتہ اللہ صاحب نے بڑی ہی کدو کاوش اور جدوجہد سے صرف سرا کی تاریخ کے کئی پہلو اجاگر کئے ہیں۔ ساتھ ساتھ انہوں نے وہاں کی عمارات کی تصاویر فراہم کرکے کتاب کی اہمیت بڑھا دی ہے۔ آپ لائق تحسین ہیں کہ اس کام کا بیڑا اٹھا کر اسے حتی المقدور پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ امید ہے کہ وہ آئندہ بھی اس کام کو جاری رکھیں گے۔

سید ابوتراب خطائی ضامن
وظیفہ یاب ریڈر۔ فرحت منزل
وی۔ آر۔ پورم
راجا محل گٹھلی۔ بنگلور

پس منظر

ریاست کرناٹک ہندو مسلمان بادشاہوں کی ایک منفرد تاریخ رکھتی ہے۔ یہ سلطنتیں مختلف زمانوں میں الگ الگ علاقوں میں قائم ہوئیں پھولیں پھلیں اور مٹ گئیں مگر ان کے آثار آج اپنی گذشتہ عظمت کی یاد تازہ کر رہے ہیں۔

کرناٹک مسلمانوں کا قدیم مسکن ہے۔ قبل اسلام بھی اور مابعد اسلام بھی۔ محمود خاں بنگلوری سلطنت خداداد میں لکھتے ہیں کہ۔ "اگرچہ مسلمانوں کے دو حملے میسور پر ہوئے۔ لیکن یہ ثبوت کہیں نہیں ملتا کہ اس زمانے میں کوئی خاندان مسلمانوں کا یہاں آباد ہوا ہو۔"[۱] ڈاکٹر آمنہ خاتون مرحومہ کے قول کے مطابق ریاست میسور میں مسلمانوں کی آبادی قبل اسلام ہی ہوئی۔ چنانچہ اپنے مقالہ "ریاست میسور میں مسلمان" میں لکھتی ہیں کہ "جنوبی ہند سے اسلام کا تعلق شمالی ہند کی بہ نسبت قدیم ہے۔ ۶۳۶ھ میں حضرت عمرؓ کے زمانے میں پہلا بیڑا مغربی ساحل بمبئی کے شمال مشرق میں بندرگاہِ تھانہ کو فوج لایا تھا۔ اس کے فوراً بعد مسلمان تاجر دکن اور جنوبی ہند سے اپنے قبلِ اسلام کے تعلق برقرار رکھتے ہوئے ساحل مالابار کے بے شمار حصوں میں مقیم ہو گئے۔ مشرقی ساحل پر تیرہ عرض بلد تک اور تیرہ سے آٹھ عرض بلد تک جنوبی ہند کی پوری سرزمین پر اور راشٹرکوٹا کے پورے ملک میں مستقل طور پر لاکھوں کی تعداد میں مسلمان بس گئے تھے۔"[۱]

---

[۱] الیٹکر ص ۲۲۷ بحوالہ ریاست میسور میں مسلمان ص ۱۰۶

ایک عرب سیاح اصطخری ۹۵۰ء میں ہندوستان آیا تھا وہ لکھتا ہے کہ "راشٹرکوٹا کے شہروں میں مسجدیں ہیں۔ ان سب میں جمعے کی اور پنجوقتہ نمازیں پڑھی جاتی ہیں۔ منبروں پر اذانیں دی جاتی ہیں اور تکبیریں اور تہلیلیں علانیہ کہی جاتی ہیں اور وہ بڑی وسیع سلطنت ہے۔ اس سلطنت کے شہروں میں جو مسلمان ہیں، ان پر حکومت کرنے کے لئے مسلمان حاکم راجہ کی طرف سے مقرر ہیں"[1]

المسعودی ۹۵۵-۹۴۴ء لکھتے ہیں کہ "سندھ اور ہند میں مالکھیڈ کے راجا کے برابر اپنے ملک میں مسلمانوں کی عزت کوئی اور راجا نہیں کرتا۔ یعنی مالکھیڈ کا راجا مسلمانوں کی بہت عزت کرتا ہے۔ اس لئے اسلام اس ملک میں خوب ترقی پر ہے۔ مسجدیں اور جامع مسجد بنائی جاتی ہیں اور ان میں باقاعدہ نمازیں ہوتی ہیں۔"[2]

دکھن کے راشٹرکوٹہ خاندان کا پائے تخت مانیا کیتھا یا موجودہ مالکھیڈ تھا۔ یہ گلبرگہ کے جنوب مشرق میں تقریباً ۴۰ یا ۴۵ میل کے فاصلے پر واقع ہے اور کرناٹک کے موجودہ حدود میں داخل ہے۔ اس خاندان کی مسلمان تاجروں سے دوستانہ رواداریوں کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس کی سوار فوجوں کا پورا انحصار عربی گھوڑوں پر تھا اور اس معاملے میں وہ عربوں کے محتاج تھے اور یہی حال بعد میں وجیانگر کی حکومت کا تھا۔ راشٹرکوٹہ خاندان نے مسلمانوں کو اس قدر آزادی دے رکھی تھی کہ آپس کے معاملے انہیں کے قاضی طے کرتے تھے[3]

سیاح المسعودی اور ابن بطوطہ (چودھویں صدی عیسوی) شہادت دیتے ہیں کہ پورے مغربی ساحل پر مسلمان اور مسجدیں تھیں، مشرقی ساحل پر بھی مسلمانوں کی آبادیاں تھیں۔ ان میں کابل پٹنم اور ناگور سب سے اہم ہیں۔ گیارہویں صدی عیسوی کے شروع میں یعنی ملک کافور کے دکن آنے سے تین سو سال پہلے ترچناپلی کے قریب ایک

---

[1] ریاست میسور میں مسلمان ص ۱۰۶، [2] تاتی نار باب ۳ بحوالہ کتاب مذکور ص ۱۰۷ [3] الٹیکر ص ۴۱۵ کتاب مذکور ص ایضاً

اسلامی مبلغ نظہرولی (سید مظہر ولی) جو ترکستان سے آئے تھے بڑی سرگرمی سے اسلام کی تبلیغ کرتے تھے اور انہوں نے بے شمار ہندوؤں کو مسلمان بنایا۔ ان کا مزار آج بھی وہاں مرجع خاص و عام ہے [1]

دکھن میں اسلامی مبلغین نے جو خدمات انجام دی ہیں اور اسلام کو پھیلایا ہے اس کے لئے ایک الگ باب ہی درکار ہے۔ دکھن کی چھ کھنڈی میں یہ علاقے اہم ہیں۔ پنگنڈہ، ملباگل، ترچناپلی اور ناگور پنگنڈہ میں بابا فخر الدین، ملباگل میں بابا حیدر ولی، ترچناپلی میں نظہر ولی مظہر اولیاء، اور ناگور میں قادر ولی شاہ الحمید نے تبلیغ کے فرائض انجام دیئے۔ ان مقامات پر ان اولیاء کے مزارات اس بات کے شاہد ہیں کہ وہ ان مقامات میں مقیم تھے۔ چکمگلور کے دادا حیات میر قلندر بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ مطلب یہ کہ اسی چھ کھنڈی میں دین اسلام کی تبلیغ ہوتی رہی۔

ہناور اکے جنوب میں بھٹکل کی بندرگاہ کے بارے میں باربوسا ۱۵۱۴ء میں لکھتا ہے کہ: "بڑا شہر ہے۔ بہت بڑا تجارت کا مقام ہے۔ اس بندرگاہ میں بہت سے جہاز ہرمز سے آکر جمع ہو جاتے ہیں۔ اور عمدہ سفید چاول اور بورا شکر لے جاتے ہیں۔ ریاست کرناٹک کے حلقہ جنوبی کیانرا کی بندرگاہ منگلور کے بارے میں عبدالرزاق ۱۴۴۵ء میں لکھتے ہیں۔ منگلور یعنی کوڑیال بندر میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی بہت گنجان آبادی ہے۔ اس میں مسلمانوں کی بہت سی مسجدیں ہیں جن میں وہ محمد صلعم کی بڑی عزت کرتے ہیں [2]

وجیانگر کے افواج میں مسلمان سپاہیوں کی ایک قوی جماعت ہوتی تھی تاریخ فرشتہ کے مطابق یہ دستور دیورایا دوم کے وقت میں شروع ہوا۔ روایت ہے کہ دیورایا دوم نے ۱۴۳۷ء میں اپنے اہم امراء اور برہمنوں سے

---

[1] ریاست میسور میں مسلمان ص ۱۰۷ [2] کتاب مذکور ص ۱۰۹

مشورہ کیا کہ اس کو ملک، آبادی اور آمدنی میں بہمنی سلاطین پر فوقیت ہونے کے باوجود وہ کیوں اکثران کے مقابلے میں ہار جاتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ مسلمانوں کی فوقیت دو وجوہ سے ہے۔ ایک ان کی سوار فوج کے گھوڑے بہتر ہیں۔ دوسری ان کے پاس ماہر تیر اندازوں کی کثیر جماعت ہے۔ اس مشورے کی بنا پر دیورایا دوم نے مسلمانوں کو فوج میں بھرتی کرنے کا حکم دیا تاکہ وہ ہندوؤں کی فنون جنگ میں تربیت کرسکیں۔ ان کو جاگیریں دیں۔ شہر وجیانگر میں ان کے لئے مسجد بنائی۔ ۱۴۳۰ء میں دیورایا دوم کی فوج میں دو ہزار ماہر تیر انداز اور دس ہزار شہسوار مسلمان تھے۔ اس نے دربار میں تخت کے قریب ایک مرصع کرسی پر قرآن مجید رکھوا دیا تھا تاکہ مسلمانوں کے دلوں میں یہ وسوسہ پیدا نہ ہو کہ وہ ایک ہندو کو سلام کر رہے ہیں۔

اسی کے زمانے میں ایران کے شاہنشاہ خاقان سعید مرزا شاہ رخ نے سفیر عبدالرزاق کو کالی کٹ کے شاہ زامورن کے پاس بھیجا۔ اس کو کالی کٹ آئے ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ دیورایا نے اسے فوراً وجیانگر آنے کی دعوت دی۔ سفیر عبدالرزاق اپریل ۱۴۴۳ء کے آخر سے ۵، دسمبر ۱۴۴۳ء تک وجیانگر میں رہا۔ عبدالرزاق اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ۔" وجیانگر کے سیاسی نظام پر فوجی نظام غالب تھا۔ شہنشاہ ایک بڑی فوج مہیا رکھتا تھا جس میں بکثرت ہاتھی سوار اور پیدل سپاہی ہوتے تھے۔ اور جاگیرداری نظام کے ماتحت ملک کے طول و عرض میں دو سو سے زیادہ نایک یا فوجی افسر تھے جنہیں محاصل وصول کرنے اور ایک معین رقبے کے انتظام کا اختیار دیا گیا تھا تاکہ وہ جنگ کے موقع پر شاہی افواج کے ہاتھیوں، گھوڑوں اور سپاہیوں کی مقررہ تعداد مہیا کرسکیں۔ مملکت وجیانگر میں باقاعدہ مدرسے تھے جہاں رنگروٹوں کو تیر اندازی اور شمشیر زنی وغیرہ کی تربیت دی جاتی تھی اور انہیں فوج میں بھرتی ہونے کے قابل بنایا جاتا

تھا. لیکن توپ خانہ عموماً غیر ملکیوں کے ماتحت ہوتا تھا۔ عبدالرزاق کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ مسلمان مملکت وجیانگر کے ہر خطے میں موجود تھے تاکہ فنون جنگ میں ملکیوں کو تربیت دے سکیں۔ [1]

رام رایا کی ملازمت میں مسلمانوں کی بڑی تعداد تھی اور اسے ان کے عقائد کا اتنا ہی لحاظ تھا جتنا کہ دکن کے مسلمان بادشاہوں کو ان کی مسلمان رعایا کا تھا رفیع الدین ابراہیم شیرازی بیجاپور میں علی اور ابراہیم کے میر حاجب تھے، ان کی تصنیف "تذکرہ احوال سلاطین بیجاپور" ۳۵ برس کی محنت سے نوے برس کی عمر میں ۱۶۰۸ء میں ختم ہوئی تھی، رام رایا کے احوال میں لکھتے ہیں کہ چھ مسلمان امیر اس کے ملازم ہوگئے۔ انھیں جاگیریں عزتیں اور رعایتیں ملیں، رام راجا مسلمانوں سے فیاضی سے پیش آتا تھا اور انہیں اپنے مذہبی امور کی بجا آوری میں پوری آزادی دے رکھی تھی اور وجیانگر کے شہر کا ایک خطہ، ترکی واڑہ (ترک واڑی) کے نام سے مسلمانوں کی رہائش کے لئے مخصوص تھا، وہاں مسجد بنوائی تھی، مسلمان اس میں اذانیں دیتے اور نمازیں پڑھتے تھے، یہاں تک کہ انھیں گائے ذبح کرنے کی اجازت تھی۔ راجا کے بھائیوں اور دوسرے امراء نے اس پر احتجاج کیا، لیکن رام راجا نے کہا کہ "ترک نوکری کرنے آئے ہیں اپنے دین کو دینے نہیں" اور لکھتے ہیں کہ رام رایا بڑا منصف راجا تھا۔ مسلمانوں کے متحد ہو کر اس کو قتل کر دینے تک اس کی ترقی جاری رہی۔ [2]

تالیکوٹہ کی جنگ کا مقصد رام رایا کی بڑھتی ہوئی طاقت اور اس کی قائدانہ حیثیت کو ختم کرنے کے لئے تھا۔ جنگ "تالیکوٹ" کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی جنگ کہنا وجیانگر کی سلطنت میں مسلمانوں کی حیثیت سے ناواقفیت کی دلیل

---

[1] کتاب مذکور ص ۱۲۱-۱۲۲ [2] JBBRAS باب ۲۲ ص ۲۸ بحوالہ کتاب مذکور ص ۱۳۳

ہے۔ بلکہ یہ جنگ رام رایا اور بہمنی حکومت کے پانچ بادشاہوں میں ہوئی وجیانگر اور بیجاپور کی افواج میں ہندو اور مسلمان دونوں تھے اور دونوں نے اپنے اپنے شاہوں اور راجا سے وفاداری اور نمک حلالی کا ثبوت دیا، مسلمان شاہوں کی افواج میں کئی مرہٹی فوجیں بھی شامل ہو گئی تھیں اور صرف بیجاپور کی فوج میں چھ ہزار مرہٹی سوار تھے۔ [۱]

سلطنت وجیانگر کا کوئی شہر یا قریہ ایسا نہیں تھا جس میں تھوڑے بہت مسلمان نہ ہوں۔ باربوسا سلطنت وجیانگر کے بیان میں لکھتا ہے کہ وہ جتنے گاؤں اور بستیوں میں سے گذرا ان سب میں ہندو آباد تھے اور ان میں چند مسلمان بھی رہتے تھے [۲]

پرتگالی سیاح PAES لکھتا ہے کہ شہر وجیانگر کے مسلمانوں کے محلوں میں بہت سے مسلمان ملکی تھے۔ ان کی تنخواہیں مقرر تھیں اور یہ کرشنا رایا کی محافظ فوج میں ملازم تھے۔ اس شہر میں ہر قوم اور ہر مذہب کے تاجر تھے جو قیمتی جواہر خصوصاً ہیروں کی تجارت کرتے تھے [۳]

کرشنا رایا کو مسلمانوں پر اس قدر اعتماد تھا کہ رایچور کے خلاف مہموں میں وہ اپنے مسلمان ملازمین کو فوج کی قیادت سپرد کر دیتا تھا [۴]

عیدوں کے موقعوں پر افواج کے مظاہرے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "پھر مسلمان انہیں ہرگز نہیں بھلانا چاہئیے کیونکہ وہ بھی نظر کے سامنے تھے، اپنے سپروں، برچھیوں، ترکی کمانوں بہت سے بموں نیزوں اور بانوں کے ساتھ اور مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ان میں ایسے لوگ تھے جو ان ہتھیاروں کا بخوبی

۱؎ ہراس ص ۲۰۰ بحوالہ کتاب مذکور ص ۱۳۴ ۲؎ ہالنگم ص ۱۹۲ بحوالہ کتاب مذکور ص ۱۳۴ ۳؎ سیول ص ۲۵۷ بحوالہ کتاب مذکور ص ۱۲۴ ۴؎ سیول ص ۳۲۹ بحوالہ ایضاً

استعمال جانتے تھے[1]

مذکورہ بالا دلائل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مسلمان ریاست کرناٹک میں ایک مدت دراز سے آباد ہیں۔ وہ بحیثیت تاجر آئے یہاں بس گئے۔ اسلام کی تبلیغ کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ راجاگان کرناٹک کی حکومتوں میں فوجی ملازمتیں کی۔ اور اپنی ایمان داری کا ثبوت، وفاداری کا ثبوت، اور نمک حلالی کا ثبوت وقتاً فوقتاً دیتے رہے۔ مندرجہ بالا مثالیں واضح کرتی ہیں کہ سرزمین کرناٹک میں وحدت میں کثرت کے جلوے دکھائی دیتے ہیں۔

---

[1] سیول صفحہ ۲۷۸ بحوالہ کتاب مذکور صفحہ ۱۲۵

تاریخ سرا

شہر سرا ٹمکور ضلع کا اہم تعلق ہے۔ یہ شہر مسلمانوں کے آثار قدیمہ ایک بہت بڑا مخزن ہے۔ شہر سرا بنگلور پونا شاہراہ نمبر ۴ پر بنگلور سے ۱۲۵ کیلو میٹر، اور ٹمکور سے ۵۰ کیلو میٹر دور شمال میں واقع ہے۔ اس شہر کی بنیاد کا سہرا شری رنگپا نائک کے سر ہے جو رتناگیری کا حکمران تھا

شہر اور قلعہ کے انتخاب کے بارے میں عام روایت وہی بتائی جاتی ہے جو دوسرے قلعوں اور شہروں کی جگہ کے انتخاب کے بارے میں بتائی جاتی ہے۔ شہر سرا کے بارے میں عموماً تاریخیں خاموش ہیں البتہ میر حسین علی کرمانی نے اپنی تصنیف تذکرۃ البلاد والحکام موسوم بہ چہار دہ الگ میں ایک باب اس شہر کے لئے وقف کیا ہے، اور نگ دوئم شرح بنائے صوبۂ سرا وذکر حکام آں بتفصیل این کہ صفحہ ۲۷ تا ۵۲، شہر کی بنائے بارے میں بھی کرمانی نے یہی روایت دہرائی ہے۔

ایک دن نایک شکار کی غرض سے جنگل میں اپنے شکاری کتوں کے ساتھ جا رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر ایک لومڑی پر پڑی۔ شکار حاصل کرنے کی غرض سے اس نے اپنے کتوں کو لومڑی پر چھوڑ دیا۔ لیکن لومڑی نے ان شکاری کتوں کا اتنا ڈٹ کر مقابلہ کیا کہ کتّے دم دبا کر واپس بھاگ آئے۔ اس منظر کو دیکھ کر نایک بہت متاثر ہوا اور اس جگہ کو مردانہ زمین کی تاثیر سمجھ کر جگہ کی بہادری کا قائل ہوا پھر اس نے وجیانگر کے اعلیٰ حکمرانوں سے اجازت لیکر شہر

چوڑا ہے کم اور ترا ہے زیادہ ملتے ہیں۔

قلعہ سرا:- ضلع ٹمکور میں جتنے اہم قلعے پائے جاتے ہیں ان میں سرا کا قلعہ بڑا انوکھا اور اہم ہے، مدھوگری، پاؤگڈھ اور نجگل وغیرہ کے قلعے پہاڑوں پر بنے ہیں اور قلعہ کی تعمیر میں پتھر آسانی سے فراہم کر لیا گیا ہے۔ لیکن سرا کا قلعہ میدانی علاقہ میں ہے۔ اسی لئے قلعہ کو زمینی

قلعہ سرا

سطح پر تعمیر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ اس شہر اور قلعہ کی بنا کس طرح ڈالی گئی اس کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ اس سے پہلے کہ قلعہ مکمل ہو رن دولہ خان نے ۳۹-۱۶۳۸ میں جو بیجاپوری سپہ سالار تھا، سلطان بیجاپور کے حکم سے رن دولہ خان کو ویربھدرا نایک کے مشورے سے اکیّری اور کرناٹک کے دوسرے علاقوں کو فتح کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ علاقۂ اکیّری ضلع شیموگہ اور جنوبی کینارا پر مشتمل ہے۔ اکیّری کو فتح کرنے کے بعد وہ بنگلور کی طرف روانہ ہوا جہاں کیمپے گوڑا بڑی شان و شوکت سے حکومت کر رہا تھا۔

راستے میں اس نے سرا کے قلعہ پر حملہ کیا اور فتح کر لیا۔ پھر بنگلور کا قلعہ فتح کرنے کے بعد وہ سری رنگا پٹن کی طرف بڑھا اور بیک وقت سری رنگ پٹن اور میسور کا محاصرہ کیا۔ ایک مہینہ تک محاصرہ رہنے کی وجہ سے کنٹھیروا نرسا نے جو وہاں کا راجہ تھا ۵ لاکھ ہن پیش کئے اور ان دولہ خان بیجاپور واپس ہوگیا۔

سرا کا قلعہ فتح کرنے کے بعد ملک حسین کو سرا کا گورنر بنایا گیا۔ انہوں نے قلعہ مکمل کیا اور شہر کے اطراف واکناف میں مٹی کا قلعہ بھی تعمیر کروایا۔ ملک ریحان یہاں پر ۱۶۳۸ - ۱۶۵۰ تک صوبہ دار رہے۔

قلعہ سرا کا پہلا دروازہ پالیگار رنگپا نایک کے دور کا ہے جو قلعہ کے شمالی حصّہ میں ہے۔ دوسرا دروازہ جس کو ڈڈی دروازہ کہتے ہیں۔ یہ بھی ہندو طرز تعمیر ہے۔ دروازوں کے بعد جو ہال بنے ہیں ان میں سنگین ستون مستعمل ہوئے ہیں۔ یہ ستون سنگ سیاہ کے آٹھ اور سولہ پہلو رکھتے ہیں ان کا اوپری حصّہ گول ہے۔ جو دراوڑی طرز تعمیر کا بین ثبوت ہے قلعہ کے اوپری حصّہ میں جو دیواریں بنی ہیں ان میں اینٹ اور گارا استعمال ہوا ہے دیواروں میں بندوقوں کے لئے سوراخ اور توپوں کے نصب کرنے کے لئے جو جگہ بنائی گئی ہے حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے دور کا اضافہ ہیں جیسا کہ سری رنگا پٹن کی فصیل میں نظر آتے ہیں۔ تیسرا صدر دروازہ بھی جس میں دراوڑی طرز کے ستون نصب ہیں ہندو طرز تعمیر کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

اندرون قلعہ ایک پرانی عمارت جو اس زمانے میں شاید تعلقہ کچہری کے طور پر مستعمل ہوا کرتی تھی اینٹوں اور پتھروں کی بنی ہوئی ہے۔ اس کے چھجے پر للّی کے پھولوں کے نشان اور محراب وغیرہ بنے ہیں جو بیجاپوری طرز تعمیر کا پتہ دیتے ہیں۔ اس عمارت کے بازو میں جو مٹی کے ڈھیر دکھائی دیتے ہیں شاید خزانہ کی عمارت ہوگی اور اس کے بازو ہی خزانہ کے دفاتر کے لئے کمرے بنے ہوئے تھے۔ یہ ساری عمارتیں

شمال مشرقی حصّہ میں تھیں۔ اندرون قلعہ کے جنوبی حصّہ میں اینٹوں ہی کا بنا ہوا
ایک حوض ہے۔ جنوب مشرقی حصّہ میں ہنومان کا مندر تھا اور رہائشی مکانات
جنوبی حصّہ میں تھے لیکن اب ان میں، وسط قلعہ تعلقہ کچہری کی ایک دیوار حوض
اور دو کنویں باقی ہیں۔ رہائشی مکانات کی چند بنیادیں اور ٹوٹے پھوٹے گارے کے
ڈھیر جن میں پانی کے پائپ کے لئے مستعمل ہونے والے گول کالی کھپریل دکھائی دیتی
ہے موجود ہیں جنوبی حصّہ میں دو قبریں ہیں مشرقی حصّہ میں حمام خانہ کی عمارت کا کھنڈر
ہے ان کے سوا کوئی دوسرا نشان قلعہ میں باقی نہیں ہے

قلعہ کی جنوبی دیوار میں ایک چھوٹا دروازہ ہے جس سے محل میں آتے ہیں۔
یہاں اب محل کے کوئی آثار باقی نہیں ہیں۔ البتہ یہ حصّہ ایک وسیع اور گہری خندق
سے گھرا ہے۔ اندرون قلعہ جنوب مغربی حصّہ میں ایک کنواں اب بھی موجود
ہے جس میں زمینی سطح اور اوپری سطح پر پانی نکالے جانے کا انتظام ہے۔ اس کے
کنویں میں پانی اب بھی موجود ہے۔ بیرون قلعہ، قلعہ سے چند گز فاصلے پر قلعہ کے
چاروں طرف خندق کھدی ہوئی ہے اور خندقوں کی دیواریں پتھر سے باندھے
گئے ہیں تاکہ پانی محفوظ رہ سکے۔ بیرون قلعہ شمالی حصّہ میں ایک محلہ آباد تھا جس
کو چک پیٹ کہا جاتا تھا۔ پرانا شہر مٹی کے قلعہ سے محفوظ کر لیا گیا تھا۔ اس مٹی
کے قلعہ کو ایک اور خندق سے محفوظ کر لیا گیا تھا۔ اب نہ شہر کے اطراف مٹی
کا قلعہ باقی ہے اور نہ خندق ہاں البتہ خندق کے کچھ کچھ آثار دکھائی دیتے ہیں۔

قلعہ سرا سنگین عمارتوں کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اس کی تعمیر میں بڑے
چھوٹے، نفیس اور کھردرے ہر قسم کے پتھر مستعمل ہوئے ہیں۔ چند سنگین ستونوں
پر نقش و نگار بھی موجود ہیں۔ اندرون قلعہ گوپال کرشنا کا مندر تھا۔ قلعہ کی
ویرانی کے بعد اس بت کو لاکر شہر کے مندر میں رکھ دیا گیا تھا۔ قلعہ کے شمال مغربی

حصّہ میں ایک محلہ آباد ہے جس کو لاڈ پور کہا جاتا ہے۔ لاڈ رقوم کے افراد اب بھی یہاں موجود ہیں۔ ان میں سے چند افراد ہجرت کر کے سری رنگا پٹن چلے گئے تھے۔ اس طرح اس قوم کے افراد صرف سرا اور سری رنگا پٹن میں ملتے ہیں۔ قلعہ سرا بھی محکمۂ آثارِ قدیمہ کی نگرانی میں ہے۔ لیکن لاپرواہی اور اس کی دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے آئے دن اس کا ایک نہ ایک حصّہ گرتا ہی جا رہا ہے۔

ریاست میسور پر مسلمانوں کا پہلا حملہ ۲۵ر فروری ۱۳۱۱ء میں ہوا۔ جبکہ سلطان علاؤ الدین خلجی کا دورِ حکومت تھا۔ اسی زمانے میں جنوبی ہند میں مدورا کے تخت کے لئے ویر پانڈے اور سندر پانڈے لڑ رہے تھے۔ ویر پانڈے کی حمایت بلّالا سوم (جس کی راجدھانی ملک میسور تھی اور پائے تخت دوارا سمدرم یعنی موجودہ ہلے بیڈ تھا) کر رہا تھا۔ یہ دیکھ کر سندر پانڈے نے سلطان علاؤ الدین خلجی سے مدد چاہی۔ خلجی نے ملک کافور کو جنوب پر فوج کشی کے لئے بھیجا۔ ملک کافور نے مدورا جاتے ہوئے بلّالا سوم کے پائے تخت پر حملہ کیا۔ جنگ میں راجہ کو شکست ہوئی ملک کافور یہاں سے بانا ورا، بنگلور اور ہسور کے راستے سے مدورا کو روانہ ہوا۔

محمد بن تغلق کے زمانے میں (۱۳۱۶ء) مسلمان پھر ایک مرتبہ حملہ آور ہوئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند سال بعد ہوئی سلا سلطنت صفحۂ ہستی سے مٹ گئی۔ ۱۳۲۴ سے ۱۳۳۵ء تک پورا دکن اور جنوبی ہند سلطان محمد کے قبضہ میں تھا۔ انتظامی نقطۂ نظر سے جنوبی ہند کو پانچ صوبوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ (۱) دیوگیری (۲) تلنگانہ (۳) کمپلی (۴) دوراسمدرا اور (۵) معبر۔ اس دس سال کے عرصے میں ان مقبوضات میں مسلمانوں کی آبادی ہندوؤں کے لئے خوفناک حد تک بڑھ گئی تھی۔ لہ

لہ فرشتہ برگس I ص ۴۲۷ بحوالہ ریاست میسور میں مسلمان

۱۴۰۰ء میں وجیانگر کے راجہ دیورایا کی بیٹی کی شادی بہمنی سلطان فیروز
شاہ سے ہوئی تو اس وقت مسلمان خاندان بہمنی سلطنت سے نقل مکان کرکے
فوجی ملازمت میں داخل ہونے لگے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس طرح مسلمان بلاری،
کڈپہ وغیرہ کے اضلاع میں پھیل گئے۔ کرشنا دیورایا کے زمانے میں مسلمانوں کی جلا
وطن کر دیا گیا۔ میسور کی تاریخ میں ۱۵۶۵ء کا وہ تاریخی واقعہ آتا ہے جبکہ جنوبی ہند کی
سب سے بڑی سلطنت وجیانگر کا خاتمہ جنگ تالیکوٹ (رکّا تنگڈی) میں ہو گیا۔
وجیانگر کی فتح نے مسلمانوں کے لئے دریائے کرشنا کا جنوبی حصّہ کا راستہ بھی کھول دیا۔
بیجاپور کی اسلامی فوجیں ۱۵۷۷ء میں میسور کا علاقہ فتح کرتے ہوئے بنگندہ پہنچیں
اور مسلمان دریائے کرشنا کے جنوبی حصّہ میں بھی آباد ہوتے گئے۔ اور مسلمانوں کی حکمرانی
بھی قائم ہوتی گئی۔ اس کے بعد بھی میسور پر مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے حملے ہوتے
رہے۔ بیجاپور کی اسلامی فوجیں رن دولہ خاں کے ماتحت جنوب کی طرف بڑھیں
اور تری کیرہ، بسواپٹن و ہری ہر پر قابض ہوگئیں۔ ساوندرگ فتح کرنے کے بعد
سری رنگاپٹن پر حملہ ہوا جو اس وقت پائے تخت تھا۔ لیکن سری رنگاپٹن فتح
نہیں ہوا۔ یہ اسلامی فوجیں ۱۶۳۸ء میں ماگڑی، بنگلور اور ساوندرگ پر اپنا
قبضہ جمالیا پھر یہ فوجیں مشرق کی طرف بڑھیں اور ۱۶۳۹ء میں کولار، ہوسکوٹہ
ویلور اور جنجی پر قابض ہوگئیں۔ پھر یہ فوجیں پائیں گھاٹ سے میسور آئیں۔
ڈوڈبالاپور، سرا اور چتلدرگ بھی مسلمانوں کے ہاتھ آگئے۔ ان مفتوحہ علاقوں کو
صوبہ کرناٹک بالا گھاٹ کا نام دیا گیا۔ اور شہر سرا کو سرا کے گورنر کا صدر مقام بنایا گیا
یہی وہ دور ہے جبکہ مسلمان بیجاپور سے آکر یہاں آباد ہونا شروع ہوگئے۔ مشرق
میں جو فتوحات ہوئی تھیں ان کو پائیں گھاٹ کا نام دیا گیا۔ میسور گزیٹیر کے مطابق
یہاں کے سب سے پہلے بیجاپوری گورنر ملک حسین بنائے گئے

ملک ریحان صوبہ سرا کے ۱۶۳۸ - ۱۶۵۰ء صوبہ دار رہے۔ میسور گزیٹیر نے ملک ریحان کے مقبرہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک کتبہ کا ذکر کیا ہے۔
رائیس نے ایپگرافیا کرناٹکا میں اس کتبہ کا نمبر B - 66 بتایا ہے۔ محمود بنگلوری نے اسی کتبہ کی نقل تاریخ جنوبی ہند میں دی ہے۔ اس کتبہ میں کہا گیا ہے کہ ملک ریحان ۱۰۴۷ھ مطابق ۱۶۳۷ء میں سرا میں رونق افروز ہوئے تاکہ سرا کی خوبصورتی کو بڑھائیں۔ ۱۰۶۱ھ مطابق ۱۶۵۰ء میں انتقال فرمایا۔ بڑے صاحب اوصاف تھے صاحب دولت و ریاست ہونے کے باوجود سیرت اولیاء کے مالک تھے۔ ان کے اہل وعیال کا پتہ نہیں چلتا

ملک ریحان سلطنت بیجاپور کے ہفتصدی منصب دار تھے۔ رن دولہ خان اور افضل خان کے ساتھ سرا کے معرکے میں بڑے جوہر دکھائے محمد عادل شاہ کے زمانے میں آپ کو سرا کا صوبہ دار مامور کیا گیا۔ تیرہ چودہ سال آپ نے حسن تدبر اور جانفشانی سے اس صوبہ کا بندوبست کیا۔ خندقیں کھدوائیں۔ آپ نے قلعہ کو فوج کے لئے مخصوص کر دیا قلعے سے باہر شہر بسایا۔ چوک اور بازار بنائے۔ قلعے سے ایک کوس کی مسافت پر ایک اور بستی آباد کی جس کا نام ملکا پور رکھا۔ (ملکا پورا ہٹی ملک ریحان کے مقبرہ کے نزدیک ہی واقع ہے) آپ بڑے نیک نفس، منصف مزاج، رحمدل اور عالی مرتبت حاکم تھے۔ ہمیشہ آبادانی اور زراعت و تجارت کی ترقی کا خیال رکھتے تھے۔ اپنے حسن سلوک سے عوام کو اپنا گرویدہ بنا لیا، پالیگار، ہندو اور مسلمان دونوں آپ کے مدّاح تھے آپ نے اپنی زندگی میں مقبرہ اور اسی احاطہ میں واقع مسجد تعمیر کروائی تھی۔ روایت ہے کہ مسجد اور مقبرہ کی تعمیر کے وقت مزدوری دینے کا طریقہ یہ تھا کہ شام کے وقت سارے مزدور اپنی مزدوری لینے کے لئے ریت کے ڈھیر بنا کر بیٹھ جاتے نماز مغرب

ادا کرنے کے بعد ملک ریحان اپنے عصا سے ان ڈھیروں کو چھوتے چلے جاتے۔ جس نے جتنی محنت اور جانفشانی سے مزدوری کی ہو اس کی اتنی ہی مزدوری اس ریت کے ڈھیر میں مل جاتی۔ حاملہ عورتوں کو دگنی اُجرت مل جاتی تھی۔

سدی (السید۔ سیدی۔ سدی) حبشی لوگوں کو کہا جاتا ہے۔ یہ السید سے مختص ہے۔ سیدی سردار کو کہتے ہیں۔ سدی اس کا بگڑا روپ ہے) سدی ملک ریحان حبشی تھے ایک سوداگر آپ کو اور آپ کی والدہ کو بیچنے کے لئے بیجاپور لایا۔ اس وقت آپ کی عمر سات سال کی تھی۔ نورس پور میں ابراہیم عادل شاہ ثانی نے دونوں کو خرید لیا اور آپ کو اپنے فرزند محمد عادل شاہ کے ساتھ پڑھنے اور کھیلنے چھوڑ دیا۔ چنانچہ آپ کی تعلیم و تربیت اور نشو و نما شاہی محل میں ہوئی۔ محمد عادل شاہ جب تخت نشین ہوا تو اس نے ابراہیم عادل شاہ ثانی کی پیشن گوئی کے مطابق آپ کو اخلاص خان کا خطاب دیکر منصب وزارت پر مامور کیا۔ چند سال بعد آپ کو فوج کا ایک امیر بنا کر کرناٹک کے قلعے فتح کرنے کے لئے رن دولہ خان کے ساتھ بھیجا۔ چنانچہ انہوں نے ۱۰۴۸ھ میں ہنگلور و سرا اور ۱۰۴۹ھ میں بسوا پٹن فتح کر لیا۔ اس کے علاوہ آپ نے کئی معرکوں میں اپنے جوہر دکھائے۔ مرد مجاہد اور غازی تھے۔ مسلمانوں کو جہاں ستایا جاتا۔ آپ وہاں پہنچ جاتے اور تادیب کرتے تھے۔ چنانچہ مرہٹوں اور راجا رایل وغیرہ کا دماغ ٹھیک کیا۔ محمد عادل شاہ نے آپ کو شولاپور کا قلعہ دار مامور کیا تھا۔ آخر میں سرا کے قلعہ دار رہے اور وہیں انتقال کیا۔

آپ کے انتقال کی تاریخ ۱۶۵۰ء ہے۔ آپ کے بعد کس نے صوبہ داری کی گدی سنبھالی یہ معلوم نہ ہو سکا۔ آپ کے حسن اخلاق و باطنی خصوصیات کے سبب سے لوگ آپ کو ولی کہتے ہیں۔ ۱۶۸۶ء تک سرا پر بیجاپوری حکمرانی رہی اور آخری گورنر آصف بہادر خان جن کا اصل نام محمود خاں کرارا تھا۔ ان کا خاندان آج بھی یہاں موجود ہے۔

جنوبی ہند کی اسلامی ریاستیں ہمیشہ ایکدوسرے کے ساتھ برسر پیکار رہتی تھیں

اور مرہٹوں کے ساتھ مل کر سلطنت مغلیہ سے بغاوت کرتی تھیں۔ اسی لئے اورنگ زیب عالمگیر نے ۱۶۸۴ء میں جنوبی ہند پر حملہ کر دیا اور ۱۶۸۷ء میں بیجاپور کی سلطنت کا خاتمہ کرتے ہوئے تمام جنوبی ہند پر قابض ہو گیا۔ ۱۶۸۷ء میں اورنگ زیب کے جنرل قاسم خاں نے بالا گھاٹ فتح کیا اور دوسرا مشہور جنرل ذوالفقار خاں نصرت جنگ نے ۱۶۹۱ء میں پائیں گھاٹ فتح کیا۔ بالا گھاٹ میں درج ذیل علاقے شامل تھے (۱) سدھوٹ (۲) گنجی کوٹہ (۳) گوتی (۴) گرم کنڈہ (۵) کھسم (۶) بلاری (۷) اننت پور۔ مغربی ساحلی علاقوں میں (۸) مالابار اور (۹) کوچین وغیرہ۔ پائیں گھاٹ میں یہ علاقہ شامل تھا (۱) گنٹور (۲) نلور (۳) چنگل پیٹ (۴) مدراس (۵) جنوبی ارکاٹ (۶) بارہ محل (۷) سیلم (۸) کوئمبتور (۹) شمالی ارکاٹ اور (۱۰) ویلور۔

بالا گھاٹ اور پائیں گھاٹ کو جب مغلیہ جنرلوں نے فتح کیا تو کل ۱۹ اضلاع کو ملا کر ایک صوبہ بنایا گیا اور اس صوبہ کا صدر مقام سرا مقرر کیا گیا۔ جو ان اضلاع میں مرکزی حیثیت کا حامل تھا اور انتظامی سہولت کے لئے موزوں مقام تھا۔ صدر مقام سرا میں سات پرگنے شامل تھے۔ (۱) بسواپٹن (۲) بودی ہال (۳) سرا (۴) پنگنڈہ (۵) دوڈبالاپور (۶) ہوسکوٹہ (۷) کولار۔ صوبہ سرا میں یہ باج گذار ریاستیں بھی شامل تھیں (۱) ہارپن ہلی (۲) کنڈارپی (۳) آنے گنڈی (۴) بدنور (۵) چتلدرگ اور (۶) میسور۔

شیواجی کا باپ شاہ جی اسلامی عساکر کے ساتھ رہا تھا اور عمدہ خدمات انجام دیئے تھے۔ اسی لئے بنگلور بطور جاگیر شاہ جی کو دیدیا گیا۔ اس طرح مرہٹے بھی میسور میں آباد ہونے لگے۔ شیواجی کا چھوٹا بھائی ونکوجی اپنے پاۓ تخت سے بنگلور بہت فاصلے پر ہونے کی وجہ سے اس کو تین لاکھ روپے پر چک دیورایا (۱۶۷۲ - ۱۷۰۴ء) کو بیچ دینا چاہتا تھا لیکن معاملہ طے ہونے سے پہلے اورنگ زیب کے جنرل قاسم خاں نے اس کو فتح کر لیا اور اسی قیمت پر جولائی ۱۶۸۷ء میں میسور کے راجا کو بیچ دیا۔ جنرل قاسم خاں کی وساطت سے

میسور کے راجا نے اورنگ زیب سے اتحاد قائم رکھا۔ اور قاسم خاں کو فوجدار دیوان کا لقب دیا۔

سرا صوبہ کی گورنری جس کو دی جاتی تھی وہ صوبہ دار کہے جاتے تھے چونکہ یہ صوبہ بہت بڑا تھا اس لئے مشرقی کرناٹک کے علاقے کے انتظام کے لئے چھوٹے چھوٹے گورنر مقرر کئے جانے لگے جو اسی صوبۂ سرا کے ماتحت ہوا کرتے تھے ذیلی صوبہ کا صدر مقام پہلے جنجی قرار دیا گیا۔ لیکن آب و ہوا کی ناخوشگواری کے باعث اس علاقے کو چھوڑ کر ارکاٹ کو صدر مقام بنایا گیا۔ جو مدراس سے ۸۰ میل کے فاصلے پر ہے

صوبۂ سرا کا پہلا مغلیہ گورنر قاسم خاں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو زیادہ طاقتور اور فاتح ثابت کیا۔ بالآخر ۱۶۹۸ء میں دوڈبیری کے پاس قتل کر دیا گیا۔ اس کے انتقال کے بعد ذوالفقار خاں اور داؤد خاں وغیرہ یکے بعد دیگرے گورنر مقرر ہوئے۔ صوبۂ ارکاٹ کا ذیلی گورنر سعادت اللہ خاں تھا۔

اورنگ زیب کے دربار میں میسور کے راجا کا دوست قاسم خاں مرگیا تو راجا نے دوستی کی تجدید کے لئے ایک سفارت ۱۷۰۰ء میں بھیجی تاکہ ممکن ہو تو مغلوں کے نئے مفتوحہ علاقوں کی سرداری حاصل کی جائے۔ سفارتِ شہنشاہ سے ایک مہر جس پر "جگ دیو" کندہ تھا راجا کو بھیجی گئی اور اس کو ہاتھی دانت کے تخت پر بیٹھنے کی اجازت ملی۔

ایک اور گورنر رستم جنگ نے اپنے دور میں قلعہ کی ازسر نو تعمیر کروائی قلعہ سے باہر شہر بسایا۔ اپنے نام کی مناسبت سے اس نے شہر کا نام تبدیل کر کے رستم آباد رکھا۔ بہادر خاں کا خطاب لیا پھر اپنا نام تبدیل کر کے کیفیت خاں رکھ لیا۔

شہنشاہ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد مغلیہ سلطنت کو زوال آنا شروع ہوا تو شہر سرا مرہٹوں اور مسلمانوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ مرہٹے شہنشاہ ہند سے فرمان حاصل کر چکے تھے لہٰذا ان ریاستوں سے خراج وصول کرنا شروع کیا۔ عالم گیر کی وفات کے بعد

حاکم سرا نواب بن بیٹھا اور دوسری طرف میسور کا راجہ بھی خود مختار بن بیٹھا۔ ۱۷۱۱ء تک ارکاٹ اور سرا کی صوبیداری ایک ہی صوبہ دار کے ماتحت ہوا کرتی تھی۔ لیکن اس سال انتظامی نقطۂ نظر سے سرا پر ایک دوسرے صوبہ دار کا تقرر ہوا جس کا نام امین خان تھا سعادت اللہ خان جو اب تک سرا اور ارکاٹ دونوں صوبوں کا صوبہ دار تھا اس تقرر کے خلاف تھا۔ مگر امین خاں اپنی زندگی بھر سرا کا صوبیدار رہا۔

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ عالم گیر کی وفات کے بعد میسور کا راجا بھی خود مختار بن گیا تھا۔ سعادت اللہ خاں اس دولت سے جو میسور میں جمع تھی واقف تھا۔ اس زمانے میں میسور کا راجا ڈوڈا کرشنا راجا (۱۷۳۱ - ۱۷۱۳) تھا۔ سعادت اللہ خاں کو میسور کے اپنے اقتدار سے نکل جانے پر افسوس ہوا۔ کیونکہ اب وہ صرف پائیں گھاٹ کا گورنر تھا۔ اس نے کڈپہ، کرنول، شاہ نور کے پٹھان نوابوں اور گتی کے مرہٹہ سردار مراری راؤ گھوڑپور کو میسور پر فوج کشی کرنے کے لئے متحد کر لیا۔ اس مرہٹہ سردار کی فوج جنوبی ہند میں بہترین منظم فوج مانی جاتی تھی اور اس فوج میں مسلمانوں مرہٹوں اور راجپوتوں کا بڑا مدبرانہ اجتماع تھا۔ سعادت اللہ خاں نے نواب سرا امین خاں سے امداد طلب کی تو نواب امین خاں نے سبقت کی فوج لیکر میسور کی طرف بڑھا۔ اتحادیوں کی فوجیں بھی آملیں دونوں میں اتحاد ہوگیا۔ سعادت اللہ خاں کو قائد مان لیا گیا۔ راجا نے ایک کروڑ روپے سعادت اللہ خاں کو دے کر صلح کر لی۔ میسور کے راجا نے روپیہ فراہم کرنے کے لئے کیپے گوڈا پر حملہ کیا اور اس کو قید کر لیا۔ کیمپے گوڈا اسری رنگاپٹن کے قید خانے میں مرگیا اور ساوندرگ کی دو سو سال کی جمع کی ہوئی دولت میسور کے ہاتھ آئی۔ سرا کے نواب امین خاں کے جانشین کمزور نکلے۔ اس وقت نظام الملک آصف جاہ صوبیدار دکن نے دخل دے کر سرا کی صوبیداری بھی سعادت اللہ خاں کے تفویض کر دی۔ اور طاہر خاں سعادت اللہ خاں کی جانب سے سرا کا صوبہ دار مقرر ہوا۔ طاہر خاں کے بعد

بھی بہت سے گورنر سرا کے صوبیدار یا نواب کے لحاظ سے مقرر ہوتے گئے لیکن تذکرۃ البلاد والحکام نے ان کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے وہ طاہر خاں کے بعد دلاور خاں کا تذکرہ کرتا ہے۔ طاہر خاں کے بعد آنے والے نوابین سرا کا دور بہت ہی مختصر رہا۔ ان کا تذکرہ وقتاً فوقتاً کیا جائے گا۔ واضح کرنا یہ مقصود تھا کہ طاہر خاں کے بعد دلاور خاں ہی اہم نواب تھا۔

نواب دلاور خان

دلاور خاں بن دلیر خاں بن داراب خاں اکبر آبادی شش ہزاری منصب دار تھا۔ نظام الملک آصف جاہ اسے اپنا بہت دوست رکھتا تھا۔ پاکنور کے بائیس پرگنے اس کو جاگیر میں دئے تھے۔ پھر اس کو طلب کر کے بہت اصرار کے ساتھ سرا کی قلعہ داری اور دیوانی بادشاہی اس کے تفویض کی۔ جب دلاور خاں قلعہ میں داخل ہوا تو طاہر خاں نے آہ وحسرت سے قلعہ چھوڑ کر شہر میں سکونت اختیار کر لی۔ ... دلاور خاں کا بیٹا افضل خاں کولار کا قلعدار تھا ۱۷۴۴ء میں جب نظام الملک آصف جاہ کرناٹک پائیں گھاٹ کا انتظام کرنے کے لئے نکلا تو نواب دلاور خاں بھی حضور کی طلبی پر ہزار سوار اور چار ہزار پیادہ اور پالیگاروں کے پانچ چھ ہزار آدمیوں کو ساتھ لیکر گیا تھا۔ اور اس مہم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد سرا واپس لوٹا۔ ۱۷۴۸ء میں نظام الملک اول کے انتقال کے بعد حیدر آباد میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو ناصر جنگ کے قتل کے مشورے میں دلاور خاں شامل تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ مظفر جنگ کو قتل کیا جائے۔ لیکن افاغنہ نے جبر سے اس پر دلاور خاں کی مہر لگوائی تھی۔ ناصر جنگ کی شہادت کے بعد وہ بخار کا بہانہ کر کے سرا واپس آگیا۔ صلابت جنگ دکن کا ناظم مقرر ہوا۔ صلابت جنگ کی نظامت کے زمانے میں راجہ سیتھل داس دیوان نے حیدر قلی خاں سے دو لاکھ روپے نذر لیکر اپنی سفارش سے اس کو صوبۂ سرا کی صوبہ داری دلوائی۔ دلاور خاں عیاش تھا۔ وہ

اپنے اکثر اوقات رنگین عمارتوں کی تعمیر میں صرف کرتا تھا. گلزار بناتا اور آبشاروں کی سیر کرتا. اپنا وقت اور روپیہ اسی میں صرف کرتا تھا. دلاور خاں کا ایک بھائی دلیر خاں نامی بھی تھا

۱۷۵۳-۵۲ء مطابق ۱۱۶۶ھ میں بالاجی راؤ پونا کے پیشوا نے ستر لاکھ روپے کی ملک کی سند صلابت جنگ سے حاصل کی. اس مبلغ میں صوبہ سرا کے بائیس تعلقے بھی داخل تھے تو پیشوا نے فوج کشی کی. بالاجی راؤ نے سند مذکور کی نقل نواب دلاور خاں کے پاس بھیجی. نواب نے ناظم حیدرآباد کی مہر دیکھی اور بلاعذر قلعے سرا کو پرگنوں کے ساتھ سپرد کر کے اس کی رسید لے لی اور نوابی سے سبکدوش ہوگیا. بالاجی راؤ نے نواب کی دیانتداری اور کثیر العیالی پر نظر کر کے اپنی طرف سے کولار کے بائیس پرگنے بطور جاگیر کے دیئے اور دلاور خاں کو کولار روانہ کر دیا۔ اور اس کی جگہ اپنے امیر بلونت راؤ کو سرا کی صوبیداری دے کر خود آگے بڑھ گیا. تین سال بعد بلونت راؤ معزول ہوگیا گوپال راؤ ناظم میرج اس صوبہ کا ناظم مقرر ہوا۔

دلاور خاں ۵۶-۱۷۲۴ء کے دور میں سرا کی آبادی ۵۰ ہزار گھروں پر مشتمل تھی اور ۵۲ مسجدیں آباد تھیں۔ اس نے اپنے دور میں ایک عالی شان محل تعمیر کروایا تھا. اور محل کے اطراف قلعہ بھی تعمیر کروایا تھا۔

۱۷۴۸ء میں نظام الملک اوّل کے انتقال کے بعد حیدرآباد میں خانہ جنگی شروع ہوگئی جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے. ناصر جنگ اور مظفر جنگ میں جنگ چھڑ گئی. فریقین کی مدد کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی سامنے آئی اور اس صلے میں کرناٹک کا ایک بڑا حصّہ کمپنی کے تفویض میں آگیا ۱۷۶۱ء میں بسالت جنگ کو معزول کر دیا گیا اور نظام علی خاں تخت نشین ہوا. حیدرآباد میں آپس کی سازشوں کی وجہ سے صلابت جنگ کو قید کر دیا گیا اور اس کے دوسرے بھائی میر نظام علی خاں اور بسالت جنگ ریاست کے حکمران

اپنے اکثر اوقات رنگین عمارتوں کی تعمیر میں صرف کرتا تھا. گلزار بناتا اور آبشاروں کی سیر کرتا. اپنا وقت اور روپیہ اسی میں صرف کرتا تھا۔ دلاور خاں کا ایک بھائی دلیر خاں نامی بھی تھا

۱۷۵۳-۱۷۵۲ء مطابق ۱۱۶۶ھ میں بالاجی راؤ پونا کے پیشوا نے ستر لاکھ روپے کی ملک کی سند صلابت جنگ سے حاصل کی. اس مبلغ میں صوبہ سرا کے بائیس تعلقے بھی داخل تھے تو پیشوا نے فوج کشی کی. بالاجی راؤ نے سند مذکور کی نقل نواب دلاور خاں کے پاس بھیجی. نواب نے ناظم حیدرآباد کی مہر دیکھی اور بلاعذر قلعہ سرا کو پرگنوں کے ساتھ سپرد کر کے اس کی رسید لے لی اور نوابی سے سبکدوش ہوگیا. بالاجی راؤ نے نواب کی دیانتداری اور کثیر العیالی پر نظر کر کے اپنی طرف سے کولار کے بائیس پرگنے بطور جاگیر کے دیئے اور دلاور خاں کو کولار روانہ کر دیا۔ اور اس کی جگہ اپنے امیر بلونت راؤ کو سرا کی صوبیداری دے کر خود آگے بڑھ گیا. تین سال بعد بلونت راؤ معزول ہوگیا گوپال راؤ ناظم میرج اس صوبہ کا ناظم مقرر ہوا۔

دلاور خاں ۵۶-۱۷۲۴ء کے دور میں سرا کی آبادی ۵۰ ہزار گھروں پر مشتمل تھی اور ۵۲ مسجدیں آباد تھیں۔ اس نے اپنے دور میں ایک عالی شان محل تعمیر کروایا تھا. اور محل کے اطراف قلعہ بھی تعمیر کروایا تھا۔

۱۷۴۸ء میں نظام الملک اوّل کے انتقال کے بعد حیدرآباد میں خانہ جنگی شروع ہوگئی جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے. ناصر جنگ اور مظفر جنگ میں جنگ چھڑ گئی. فریقین کی مدد کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی سامنے آئی اور اس صلے میں کرناٹک کا ایک بڑا حصہ کمپنی کے تفویض میں آگیا ۱۷۶۱ء میں بسالت جنگ کو معزول کر دیا گیا اور نظام علی خاں تخت نشین ہوا. حیدرآباد میں آپس کی سازشوں کی وجہ سے صلابت جنگ کو قید کر دیا گیا اور اس کے دوسرے بھائی میر نظام علی خاں اور بسالت جنگ ریاست کے حکمران

ہوئے۔ دریائے کرشنا کے جنوب کا حصّہ بسالت جنگ کے حصّہ میں آیا جس کا مستقر ادھونی تھا۔ وہ جنوب میں اپنے مقبوضات کی توسیع کرنا چاہتا تھا۔ تو اس نے پہلے سرا اور پھر ہوسکوٹے پر جو اس وقت مرہٹوں کے قبضے میں تھا، پانی پت میں مرہٹوں کی شکست کا حال سن کر بسالت جنگ نے صوبہ سرا اور ہوسکوٹہ کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا قلعہ فتح کرنے کے ڈھنگ سے بسالت جنگ ناواقف تھا نتیجہ یہ ہوا کہ محاصرہ طول پکڑا جس پر بسالت جنگ نے حیدر علی کی مدد چاہی۔ فریقین میں ایک معاہدہ طے پایا۔ جس کی رو سے

۱) قلعہ کا سامان و آلات بسالت جنگ کو ملیں

۲) ہوسکوٹہ اور اس کے مضافات حیدر علی کو ملیں

۳) بسالت جنگ دربار دہلی میں صوبہ داری سرا کے لئے حیدر علی کی سفارش کرے۔

۴) قلعۂ گرم کنڈہ جو اب تک حیدر آباد کے ماتحت تھا آئندہ حیدر علی کی ملکیت قرار دی جائے۔

حیدر علی نے چند ہی دنوں میں ہوسکوٹہ فتح کر لیا اور معاہدہ کے مطابق قلعہ کا تمام ساز و سامان حیدر نے بسالت جنگ کے حوالے کر دیئے اور تمام مضافات میسور کی مملکت میں شامل کر لئے گئے۔ اور یہ بات مشہور ہے کہ بسالت جنگ نے تمام سامان حرب حیدر علی کے ہاتھ فروخت کر دیا جس کے سبب سے حیدر علی بسالت جنگ کو تاجر کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ شہنشاہ ہند کا سفیر حیدر علی کے نام فرمان صوبیداری سرا لیکر آیا اور اس کے ساتھ شہنشاہ کی جانب سے سپر، شمشیر مرصع کار، پالکی جواہر نگار، ماہی مراتب اور نقارہ و نشان مع خطاب نواب عنایت ہوئے۔ بسالت جنگ کے جانے کے بعد حیدر علی نے مرگ سرا مدھوگری، آلیس نگر اور سرا پر قبضہ کر لیا اور اسی طرح قریب قریب کل صوبۂ سرا پر حیدر علی کا تسلط ہو گیا۔ تمام پالیگاروں نے حیدر علی کو خراج دینا منظور کر لیا۔ ۱۷۶۵ء میں بالا جی راؤ کے مرنے کے بعد مادھو راؤ پیشوا ہوا

تو اس نے از سر نو مرہٹی سلطنت کی تنظیم شروع کی۔ حیدر علی نے جب بدنور، مالابار اور شاہ نور پر قبضہ کر لیا تو پیشوا کو حیدر علی کی ابھرتی ہوئی طاقت شاق گذری۔ اس نے اس نے اپنی کمان میں ایک لاکھ سوار ساٹھ ہزار پیادے، پچاس ہزار تیر انداز اور ایک بھاری توپخانہ لے کر میسور کی طرف بڑھا۔ مادہو راؤ کے آتے ہی شاہ نور کا نواب عبد الحکیم خاں اور چتلدرگ کا راجا اس سے مل گئے۔ مادہو راؤ اب سرا کی جانب بڑھا۔ چند دن کی لڑائی کے بعد میر رضا علی خاں نے مادہو راؤ کو سرا کا قلعہ ۱۷۶۶ء میں حوالے کر دیا اور وہ مادہو راؤ کا ملازم بن گیا۔ مادھو راؤ نے گرم کنڈہ کا علاقہ جاگیر میں دیکر اس کے نواح کا بندوبست میر رضا علی خاں کے سپرد کر دیا۔ جب یہ خبر حیدر علی کو پہنچی تو حیدر علی خاں نے ایک زبردست منصوبہ کے تحت مادھو راؤ پر شب خون مارتے۔ مگر اس کے ہمراہ کا یہ شب خون اتنا زبردست تھا کہ آدھے سے زیادہ مرہٹی فوج کٹ گئی۔ اور باقی فوج آلات حرب چھوڑ کر میدان خالی کر دی۔ اس شب خون سے مادھو راؤ کی ہمت نہ ہوئی کہ آگے بڑھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مرہٹی فوجیں آگے بڑھنے سے رک گئیں۔ اسی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حیدر علی نے مادھو راؤ کو سات لاکھ روپیہ بھیجا اور پچاس لاکھ دینے کا وعدہ بھی کیا اور یہ بھی لکھا کہ مرہٹی فوجوں نے تمام ملک کو پائمال کر دیا ہے۔ اس کے باوجود مجھے جنگ جاری رکھنے میں عار نہیں چونکہ رعیت تباہ ہو رہی ہے اس لئے بہتر ہے کہ آپ اس نذرانہ کو قبول کرتے ہوئے واپس ہو جائیں۔ مادھو راؤ نے اس کو ایک خداداد فتح تصور کیا۔ اور پونا کی جانب واپس ہو گیا۔ اس کے بعد نواب حیدر علی نے از سر نو سلطنت کے انتظام کی طرف توجہ کی۔ اس دن سے سرا تیس ۳۳ سال تک حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے ماتحت رہا۔ ۱۷۷۴ء میں ٹیپو سلطان نے پھر سرا کو فتح کیا سرا پھر سلطنت خداداد میں شامل رہا۔ ۱۷۹۱ء میں ایک سال کی مختصر مدت کے لئے پھر مرہٹوں نے سرا پر قبضہ کر لیا۔ لیکن ٹیپو سلطان نے مرہٹوں کو ایسا مار بھگایا کہ وہ

سرا کا رخ نہ کر سکے۔ ۱۷۹۱ء میں جب مرہٹوں نے سرا پر حملہ کیا تھا اس وقت غلام محی الدین سرا کے قلعدار تھے۔ مرہٹوں کے اس عبوری دور میں بھی دو کتبے ملتے ہیں جو مرہٹی زبان میں ہیں یہ ۱۷۷۶ء کے ہیں جو چن راٹے درگا میں ملے ہیں جب کہ وہ اس شہر کا محاصرہ کئے ہوئے تھے۔

۱۷۶۱ء میں جب حیدر علی خاں کو نواب کا خطاب ملا تو اس وقت شہر سرا بڑا ہی شاندار شہر تھا۔ نواب دلاور خاں کا محل باغ وغیرہ جاذب نظر تھے۔ انہیں محلات کے نمونے کو سامنے رکھ کر حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے بنگلور اور سری رنگا پٹن میں محلات تعمیر کروائے جو آج بھی موجود ہیں۔ سرا کے خان باغ کے نمونے کو سامنے رکھ کر شاید حیدر علی نے بنگلور کا لال باغ بنوایا تھا۔ اور سری رنگا پٹن کے محلات کے باغات بھی لگوائے تھے۔ کہا جاتا ہے بنگلور اور سری رنگا پٹن کے قلعے بھی سرا کے قلعے کے نمونے کو سامنے رکھ کر بنوائے گئے تھے۔ بنگلور کا قلعہ بھی سرا کے قلعہ کی طرح زمینی سطح پر موجود ہے۔ سری رنگا پٹن کو قدرتی فصیل یعنی دریائے کاویری موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود شہر کی حفاظت کے لئے ٹیپو سلطان نے سرا کے قلعہ کے نمونے پر شہر کے اطراف قلعہ تعمیر کروایا اور خندقیں کھدوائیں۔ کہا جاتا ہے کہ ٹیپو سلطان نے سرا کی آبادی کو اپنے نئے بنائے ہوئے شہر گنجام میں آباد کرانے کے لئے منتقل کروایا تھا تاکہ وہاں نئے نئے قلعے، عمارتیں اور محلات وغیرہ تعمیر کر سکیں۔ لیکن خیال یہ کیا جاتا ہے کہ شہر سرا کی مرکزی حیثیت کے ختم ہو جانے کے بعد سری رنگا پٹن کو میسور کا پایۂ تخت بنایا گیا تو لوگ روزگار حاصل کرنے اور نئے نئے کاموں میں مصروف ہونے کے لئے شہر سرا سے ہجرت کر گئے نہ کہ ان کو زبردستی یہاں سے منتقل ہونے کے لئے مجبور کیا گیا۔ اس طرح سرا کی تقدیر وقتاً فوقتاً بدلتی گئی۔ سیاسی رسّہ کشی اور مرہٹوں کے بار بار حملوں نے اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی۔ اور یہاں کی آبادی بھی دوسری طرف

منتقل ہونے کی وجہ سے گھٹتی چلی گئی اور سرا کے عالی شان محلات مساجد و قلعہ کھنڈر میں تبدیل ہوتے چلے گئے۔

۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد سرا بھی انگریزوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ اب اس کی حیثیت ایک صوبہ کے صدر مقام کی نہیں بلکہ ایک تعلقہ کی تھی جو ضلع چتلدرگ میں ضم کر دیا گیا پھر ۱۸۶۶ء میں اس تعلقہ کو ٹمکور ضلع میں ضم کر دیا گیا آج بھی یہ ضلع ٹمکور میں ہے

حیدر علی و سرا

نواب حیدر علی خان کے آبا و اجداد کا تعلق سرا سے بہت قدیم ہے۔ مختلف مصنفین نے اپنی اپنی تصانیف میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ جن کا ذکر وقتاً فوقتاً آگے آئے گا۔

محمود بنگلوری نے حملات حیدری کے حوالے سے سلطنت خداداد میں لکھا ہے کہ نواب حیدر علی خان کی والدہ کا نام مجیدہ بیگم ہے جو فتح محمد کی دوسری بیوی ہیں مجیدہ بیگم میر اکبر علی خاں زمیندر سرا کی لڑکی ہیں۔ صوبہ سرا کے صوبہ دار نے میر اکبر علی خان کو زمین کی واجب الادا رقم کی ادائیگی کے لئے لکھا انہوں نے چھ ماہ کی مہلت طلب کرتے ہوئے تمسک لکھدیا اور چھ ماہ ہونے سے بیشتر ہی ان کا انتقال ہوگیا۔ چھ ماہ بعد وصولی کے لئے سرا سے طلبی آئی تو میر اکبر علی خاں مرحوم کی بیوہ اس رقم کو ادا نہ کر سکیں رقم کی طلبی کے لئے فتح محمد ہی آئے تھے۔ انہوں نے جب یہ حالت دیکھی تو پیغام دیا کہ اگر آپ مجھ کو اپنی دامادی میں قبول کرلیں تو یہ رقم میں اپنی جانب سے ادا کردوں گا۔ چنانچہ میر اکبر علی خاں کی بیوہ نے یہ پیغام قبول کرلیا اور اس طرح مجیدہ بیگم فتح محمد کے نکاح میں آئیں۔ میر اکبر علی خاں گمن ہلی کے زمیندار تھے۔ یہ قریہ سرا کے عروج کے زمانے میں مسلمانوں کی کثیر آبادی کا علاقہ تھا۔ مجیدہ بیگم کے بطن سے حیدر علی نے جنم لیا۔

سرا کی صوبہ داری کے لئے جب عبدالرسول خاں اور طاہر خاں میں جنگ ہوئی تو فتح محمد اور ان کا بڑا لڑکا دونوں مارے گئے۔ عباس قلی خاں جو طاہر خاں کا فرزند تھا دوڈبالاپور کا حاکم مقرر ہوا تو اس نے فتح محمد پر یہ الزام لگایا کہ حکومت کی بہت سی رقم ان پر واجب الادا ہے۔ یہ الزام عباس قلی نے صرف اس لئے لگایا تھا کہ فتح محمد عبدالرسول خاں کے طرف سے طاہر خاں پر جنگ کی تھی جب وہ شہید ہو چکے تو ان کے خاندان والوں کو ستانے کے لئے اس نے یہ بہانہ تراشا اور اس قرضہ کی ادائیگی کے لئے شہباز، حیدر علی اور ان کی والدہ پر ظلم وستم کرنے لگا۔ جس سے یہ تنگ آکر بنگلور چلے گئے۔ جہاں حیدر علی کے ماموں ابراہیم صاحب بنگلور کے قلعدار کے ملازم تھے۔ شہباز کے بڑے ہونے پر فوج میں ملازمت مل گئی۔ اس کے بعد دیون ہلی جانا پڑا۔ میسور کے راجہ کی فوج دیون ہلی کا محاصرہ کئے ہوئے تھی۔ اس کی کمک کے لئے بنگلور کے قلعہ دار نے فوج روانہ کی جس میں شہباز بھی شامل تھے۔ اگرچہ حیدر علی فوج میں ملازم نہیں تھے۔ لیکن اپنے بھائی کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ دیون ہلی کا محاصرہ نو۹ مہینے تک جاری رہا۔ اس عرصہ میں حیدر علی نے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر جوانمردی کے وہ جوہر دکھائے کہ وزیر نندراج خوش ہو کر ان کو میسوری فوج میں بعہدۂ نائک داخل کر لیا اور حیدر علی کے زیر کمان پچاس سوار اور دو سو پیادے دئے گئے۔ دیون ہلی ہی وہ جگہ ہے جہاں سے حیدر علی کا نیرّ اقبال چمکا۔

حیدر نامہ کا مصنف لکھتا ہے کہ حیدر علی کے آبا و اجداد عربستان سے بیجاپور آئے۔ یہاں بادشاہ کے پاس معقول عہدہ پایا۔ بہت دنوں تک یہیں سکونت پذیر رہے بہت دنوں کے بعد فتح محمد، غلام حیدر اور غلام علی جو حقیقی بھائی تھے۔ بیجاپور سے کولار آئے۔ ان کے بزرگوں کے انتقال کے بعد تلاش معاش میں نکلے۔ اس وقت سرا کا نواب دل دلاور خاں تھا۔ فتح محمد نواب کے پاس آئے تو نواب نے فتح محمد کو پانچ

سو سواروں کی سرداری عطا کی اور نئے پیادے بھرتی کرنے کا حکم دیا۔ اس وقت سے وہ فتح نایک کے نام سے مشہور ہوئے۔ نایک قریوں کے محاوروں میں پیادوں کے سردار کو کہا جاتا ہے۔ دوسرے بھائی مدھوگری کے حاکم مل راج کے پاس پہنچے اور نوکر ہوئے اور چھوٹے بھائی غلام علی دوڈ بالاپور کے پالیگار کے پاس نوکر ہو گئے۔ اس طرح یہ تینوں بھائی ایک ایک قلعہ پر مسلط ہو گئے۔

اپنے کے سنہا مصنف حیدرِ علی لکھتا ہے کہ حیدر علی کے جدّ اعلیٰ ولی محمد دہلی سے آکر گلبرگہ میں آباد ہو گئے۔ خاندانی روایت کے مطابق ان کا شجرۂ نسب قبیلہ قریش سے جا ملتا ہے۔ حیدر علی کے دادا محمد علی سرا میں سکونت پذیر تھے۔ کھیتی باڑی کرتے اور باغات پٹّے پر لیتے تھے ایک بار انہوں نے اپنے بیٹوں سے جو دنیاوی جاہ وحشمت کے خواہشمند تھے کہا تھا ہمارے آبا و اجداد نیک و متقی لوگ تھے۔ اور اگر وہ چاہتے تو دنیاوی جاہ و حشمت حاصل کر سکتے تھے۔ مگر انہوں نے اپنے آپ کو دنیاوی علائق سے بچائے رکھا۔ فتح محمد محمد علی کے چوتھے فرزند تھے انہوں نے اور ان کے بھائیوں نے سپہ گری کا پیشہ اختیار کیا۔ وہ لومڑی کی طرح گوشۂ گمنامی میں پڑے رہنے کے قائل نہیں تھے وہ ایک حوصلہ مند سپاہی تھے۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے مختلف امراء کے ہاں قسمت آزمائی کرتے رہے۔ اگرچہ مختلف سرداروں کے تحت ملازمت بھی کرتے رہے۔ انہوں نے کچھ دنوں ارکاٹ اور میسور میں ملازمت کی اور سرا کے حاکم نواب درگا قلی خاں کی ملازمت میں بحیثیت چار سو پیادہ اور سو سواروں کے افسر کا نمایاں مقام حاصل کیا درگا قلی خاں کی موت کے بعد فتح محمد نے اس کے بیٹے عبدالرسول خاں کے ساتھ خود کو وابستہ کر دیا اور ۱۷۲۸ء میں سرا کے صوبیدار طاہر خاں کے درمیان جنگ میں کام آئے۔ فتح محمد کا خاندان جو دوڈ بالاپور میں سکونت پذیر تھا درگا قلی خاں کے ایک اور بیٹے عباس قلی خاں کے ظلم وستم کا نشانہ بن گیا۔

اس نے حیدر اور بڑے بھائی شہباز کو ان کے خاندان سے مزید روپیہ حاصل کرنے کے لئے سخت اذیتیں دیں اور آخر کار ان کو قید کر لیا۔ یہ قرضہ دس ہزار ہُن تھا (ہُن چھوٹے سونے کے سکّے کو کہتے ہیں) دونوں بھائیوں نے چچا کے سامنے یہ سرگذشت بیان کی۔ غلام حیدر نے ساری تفصیل اپنے چھوٹے بھائی غلام علی کو لکھی۔ غلام علی نے مل راج کو ساری تفصیل سنائی اور وہ خط بھی پیش کیا جو غلام حیدر نے لکھا تھا۔ مل راج حاکم مدھوگری نے دیوراج دلوائی حاکم میسور کو ایک تفصیلی خط لکھا جس کے بعد دلوائی نے حکم دیا کہ ساری مبلغ سرکاری خزانہ سے دیکر ان کو اپنے پاس بلالو اس حکم کے ملتے ہی ساری مبلغ ادا کر دی گئی اور تمام وابستگان کو مدھوگری بلا لیا۔ وہ مدھوگری میں سکونت پذیر رہے۔ جیساکہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ شہباز کو فوج میں ملازمت ملی۔ بنگلور کی کمک دیون ہلّی پہنچی تو شہباز کے ساتھ ساتھ حیدر علی نے بھی جوانمردی کا مظاہرہ کیا جس سے خوش ہو کر وزیر نند راج نے حیدر علی کو نائیک کے عہدہ پر فائز کیا اس طرح حیدر علی کا یہ خاندان سرا سے کوچ کرتا ہوا مدھوگری بنگلور ہوتا ہوا سری رنگا پٹن پہنچا۔

جنگ گمن ہلی میں فتح محمد اور ان کے بیٹے جو شہید ہوئے تھے اس کا ثبوت مختلف مصنفین کی تصانیف سے ہوتا ہے۔ آج بھی ان دونوں کی قبریں گمن ہلی میں موجود ہیں۔ ایک پتھر کا چبوترہ ہے۔ اسی میں یہ دونوں قبریں ہیں۔ گمن ہلی والوں کی زبانی میں نے سنا ہے کہ سری رنگ پٹن کے عرس کے موقع پر لواحقین ٹیپو یہاں آتے ہیں اور زیارت کے بعد واپس ہو جاتے ہیں۔ ان قبروں پر لوح یا نام وغیرہ نہیں ہے مقامی روایت کے مطابق یہ فتح محمد اور ان کے بیٹے کی قبریں ہیں۔ اس کے سوا مسلمانوں کی اور کوئی قبریں دکھائی نہیں دیتیں۔

سرا اور میر صادق

میر محمد صادق کا ننہال صوبہ سرا تھا۔ اس کے بارے میں نشان حیدری کا مصنف لکھتا ہے کہ "میر محمد صادق کہ نبسہ[۱] میر احمد خاں جاگیردار تعلقہ ہلکور و او یکے از منصب داران صوبہ سرا بود میشد و یا مدت میر مذکور بکو توالی رکاب بازار لشکر نامزد شدہ بکفایت شعاری و جزرسی بسر می برد بصوابداری یعنی کروڑگی شہر ارکاٹ مامور گردید"

میر محمد صادق میر احمد خاں جاگیردار تعلقۂ ہلکور کا نواسا تھا یہ جاگیردار صوبہ سرا کے منصب داروں میں سے ایک تھا، ایک عرصے سے میر صادق فوج کے رکاب بازار کا کوتوال تھا۔ اور کفایت شعاری اور جزرسی سے بسر کرتا تھا، نواب نے اس کو شہر ارکاٹ کی صوبیداری پر مامور کیا۔

مغل سردار قاسم خاں نے فوج کشی کی دوڈ بالا پور کا پالیگار نارائن سوامی چک بالا پور کو ہٹ گیا۔ دوڈ بالا پور سرا کے سات اضلاع میں سے ایک تھا، لیکن بہت جلد مرہٹوں نے اس کو مسلمانوں سے چھین لیا۔ پانی پت کی جنگ کے بعد مرہٹوں کو زوال آیا تو نظام نے دوڈ بالا پور پر قبضہ کر لیا اور اس کو وہیں کے ایک باشندے عباس قلی خاں کو بطور جاگیر دیدیا گیا۔ جیسا کہ اوپر بیاں کیا جا چکا ہے کہ عباس قلی خاں جو طاہر خاں کا فرزند ہے دوڈ بالا پور کا حاکم بن جانے کے بعد حیدر علی کے والد فتح محمد کے عبدالرسول خال سے وابستہ ہونے پر ان کے خانداں پر ظلم و ستم کیا تھا۔ جب نظام الملک نے دوڈ بالا پور کو اس کی جاگیر میں دیدیا تو اس نے قلعہ کی توسیع کی۔ اسلامی وضع کے بہت سے

---

۱ نشان حیدری ۲-۲۰۱۔ بحوالہ شہادت جنگ سلطانی صفحہ ۱۸-۱۷ مائیلس کا ترجمہ میر صادق (نوٹ: میر صادق کا دادا ایک جاگیردار اور صوبہ سرا کا ایک منصب دار تھا) کو ر نواسا تھا میر احمد خاں کا جو وہل کور "Whul-Koor" کا جاگیردار اور سلطان کا مخبر اور مشیر تھا۔ شہر ارکاٹ کی صوبہ داری جو ایک مدت تک نواب کی فوج کے بازار کا کوتوال تھا۔ اور سلطان کا مخبر اور مشیر تھا۔ شہر ارکاٹ کی صوبہ داری دی گئی صفحہ ۳۹۶

باغ لگائے اور اپنے لئے ہر طرح کے آرام کا ایک گھر بنایا۔ پھر جب حیدر علی نے اقتدار حاصل کیا تو عباس قلی خاں اپنے بچّوں کے ساتھ پائیں گھاٹ چلا گیا اور نواب ارکاٹ کا ملازم ہو گیا۔ اس کی ایک بیوی اور ایک پوتے نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کیا۔ حیدر علی نے ان کو ایک قلیل مشاہرہ مقرر کیا۔ دوڈ بالاپور میں ہی زندگی گذارتے رہے۔ پھر انگریزوں کے دور حکومت میں بھی یہ مشاہرہ جاری رہا۔ میر صادق اسی شہر میں پیدا ہوا۔ اس نے دوڈ بالاپور میں ایک باغ لگا کر شہر کی زینت بڑھائی میر صادق اور عباس قلی خاں کے لگائے ہوئے باغات کی نگہداشت میسور کے راجا کے زمانے تک ہوتی رہی۔ [لہ]

نشان حیدری کے اور بچانن کے قول سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ میر صادق دوڈ بالاپور میں پیدا ہوا جو اب ضلع بنگلور میں ہے اور اس وقت صوبۂ سرا میں تھا۔ اسکے علاوہ اس کا نانا صوبۂ سرا کے منصب داروں میں سے ایک تھا۔ میر صادق ارکاٹ کا صوبیدار بنائے جانے سے پہلے تک ایک مدّت تک نواب کی فوج میں ملازم تھا۔

شہر سرا تقریباً ایک سو اسّی سال تک صوبہ کا صدر مقام رہا۔ اس صوبہ پر پہلے بیجاپوری حکومت نے پھر مغلیہ حکومت نے اور آخر میں سلطنت خداداد اور مرہٹوں نے اس صوبہ پر اپنا قبضہ قائم رکھا۔ ذیل میں یہاں کے حاکم (گورنر یا صوبہ داروں کی فہرست دی (داروں) جاتی ہے۔

بیجاپوری دور

۱۶۳۸ - ۱۶۸۶

سرا پر رن دولہ خاں کا حملہ

۱۶۳۸ء

ملک حسین گورنر

۱۶۳۸ء

لہ سفرنامۂ بچانن صہ ۲۴۰ بحوالہ شہادت جنگ سلطانی صہ ۱۶ از آمنہ خاتون

ملک ریحان صوبہ دار ۱۶۳۸-۱۶۵۰

آصف بہادر خاں (محمود خاں کرارا) ۱۶۸۶

مغلیہ دور

۱۶۸۶ - ۱۷۶۱

قاسم خان :- ۱۶۸۶

یہ سرا کا پہلا مغلیہ صوبہ دار اور سپہ سالار بھی تھا

ذوالفقار خاں تاریخ نامعلوم

آتش خاں ۱۶۹۴ء

کیفیت خاں ۱۶۹۶ء

قراد منو خاں منو ۱۶۹۷ء

دُقتا منو خاں معو ۱۷۰۴ء

یداد اللہ خاں ۱۷۰۶ء

داؤد خاں ۱۷۰۷ء

سعادت اللہ خاں ۱۷۰۹ء

یہ سرا اور ارکاٹ دونوں کا حاکم تھا۔ اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد خود مختاری کا اعلان کیا اور نواب بن بیٹھا۔ اس کے جانشین بھی نواب ہی بنے رہے

کیفیت خاں

(اصل نام رستم جنگ خطاب بہادر خاں۔ تبدیل شدہ نام کیفیت خاں)

امین خان ۱۷۱۱ء

طاہر خاں تاریخ نامعلوم

نجیب خاں ء

غالب خاں	۱۷۱۳ء
درگا قلی خاں	۱۷۱۵ء
مکھاور خاں	۱۷۱۶ء
دسا قلی خاں	۱۷۲۰ء
عبدالرسول خاں	۱۷۲۱ء
طیار محمد	۱۷۲۲ء
دلاور خاں	۱۷۲۴ - ۵۲ء
دل دلاور خاں	تاریخ نامعلوم

مرہٹی دور

بالاجی باجی راؤ کا سرا پر قبضہ	۱۷۵۲ء
پہلا مرہٹی صوبہ دار بلونت راؤ	۱۷۵۲ - ۵۵ء
گوپال راؤ ناظم میرج صوبہ دار	۱۷۵۵ - ۵۶ء
جمناجی پنت جی	۱۷۵۶ - ۵۷ء
بسالت جنگ کا سرا پر قبضہ	۱۷۵۷ء
نواب حیدر علی خاں	۱۷۵۷ء

حیدر علی خاں کو نواب سرا کا خطاب دیا گیا گویا آپ سرا کے آخری مغلیہ نواب تھے اس کے بعد آپ نے سلطنت خداداد کی بنا ڈالی اور صوبۂ سرا آپ کے ماتحت چلا گیا۔ آپ نے اپنے بھانجے میر رضا علی کو صوبہ دار بنایا۔

میر رضا علی خاں ۱۷۵۷ - ۱۷۶۱ء

بالاجی باجی راؤ کے انتقال کے بعد مادھو راؤ پیشوا کا سرا پر قبضہ ۱۷۶۱ - ۱۷۶۹ء

بابوجی سندھیا سرا کا قلعہ دار ۱۷۶۹ء

سرا پر حیدر علی کا قبضہ ۱۷۶۹ء

۱۷۶۹ء سے ۲۳ سال تک سرا پر حیدر علی خان اور ٹیپو سلطان کا قبضہ برقرار رہا۔ ۱۷۹۱ء میں لارڈ کارنوالس، نظام الملک اور ناظم پونا سے اتفاق کر کے ٹیپو پر فوج کشی کی تھی تو ہری پنت پھڑکیا نے ۹۲-۱۷۹۱ء میں غلام محی الدین قلعہ دار سے قلعہ لے لیا اور ایک سال تک حکومت کی۔ پھر ٹیپو سلطان نے مرہٹوں کو ایسی شکست دی کہ وہ سرا کا رخ نہ کر سکے۔ پھر ٹیپو سلطان کا قبضہ ۱۷۹۹ء تک برقرار رہا۔ ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد سرا کا قلعہ بھی کمپنی میں داخل ہو گیا[1]

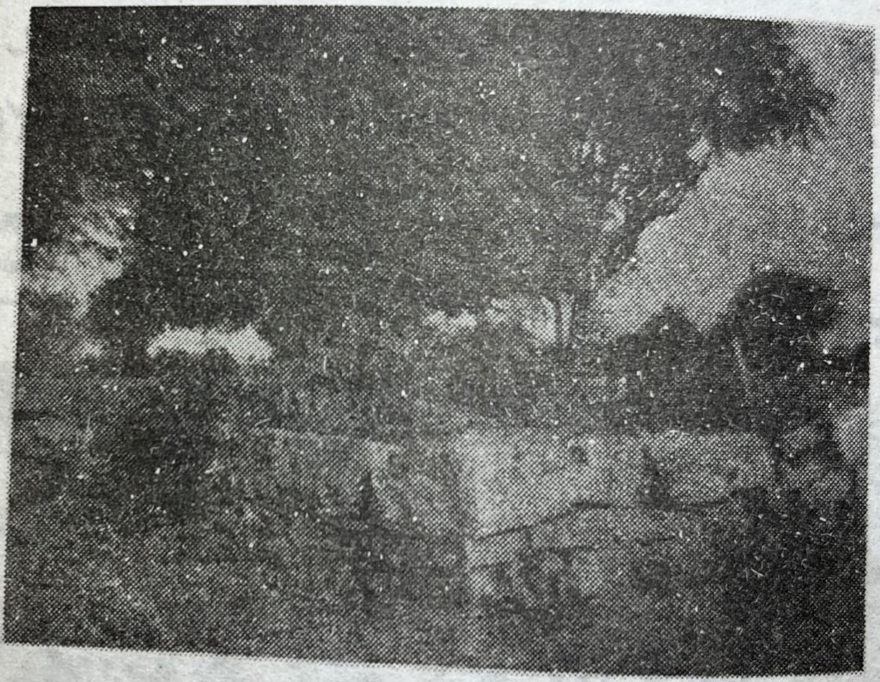

مزار فتح محمد (گمنہلی)

---

[1] گورنروں یا صوبہ داروں کی تفصیل اور تاریخ کا حوالہ ۱) مکنزی کے مخطوطات بحوالہ میسور گزیٹر ۲) و تذکرۃ البلاد والحکام بحوالہ ریاست میسور میں اردو - از آمنہ خاتون

قدیم عمارات سرا

سرا پر مسلمانوں نے ۱۷۹۹ - ۱۶۳۸ء تک یعنی تقریباً پورے دو سو سال تک حکومت کی۔ اس دور کی یادگاریں یہاں کی قدیم عمارات ہیں۔ ضلع ٹمکور میں صرف سرا تعلقہ ہی ایک ایسا تعلقہ ہے جہاں ہمیں عادل شاہی مغلیہ اور سلطنت خداداد کے دور کی نشانیاں ملتی ہیں۔ جامع مسجد، مسجد احراری، ملک ریحان کا مقبرہ، عیدگاہ، فرید اللہ شاہ حسینی کا مقبرہ محمود خاں کا روضہ، ابراہیم روضہ وغیرہ اس دور کی نفیس، شاندار اور خوبصورت عمارات ہیں ذیل میں انہیں تاریخی عمارتوں کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا۔

جامع مسجد سرا

یہ مسجد عالم گیری دور کی یادگار ہے۔ میسور گزیٹیر نے اس مسجد کی بہت تعریف کی ہے اور بتایا ہے کہ اس کے

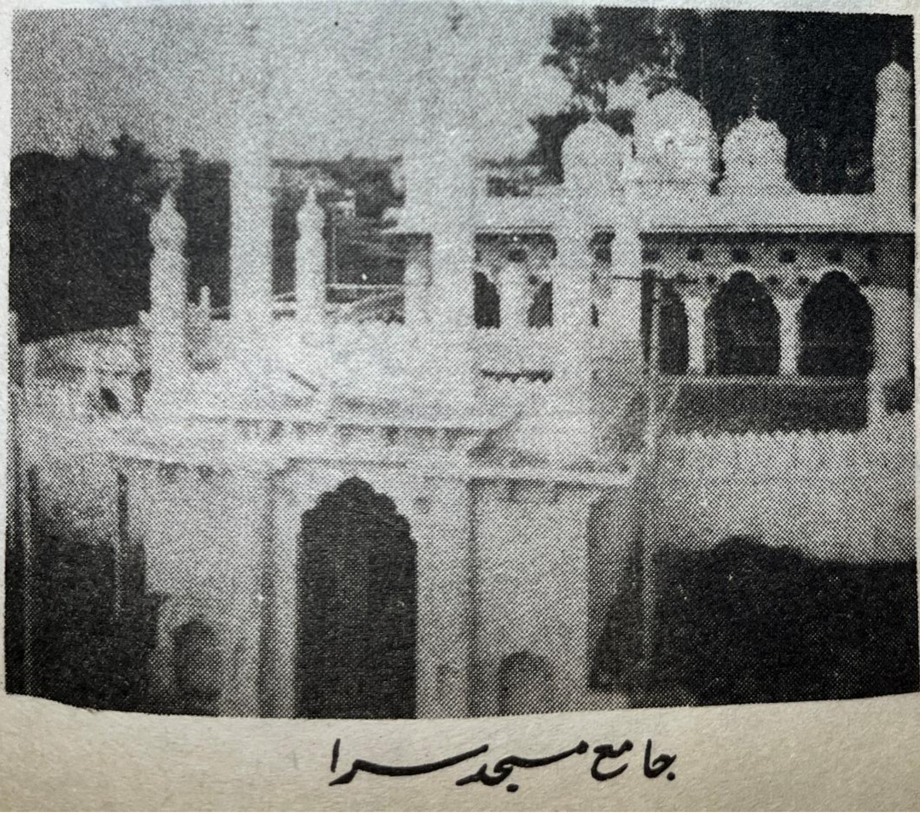

جامع مسجد سرا

تعمیر کرانے والے ایک حکمران شیخ فرید اور شہر بانو تھے۔ گزیٹر نے مسجد کی تعمیر کی تاریخ ۱۶۹۶ء/۱۱۰۸ھ لکھی ہے۔ یہ تاریخ لفظ بیت المقدس سے نکالی ہے

ریاست میسور میں عربی فارسی اور اُردو کتبے مولف میر محمود حسین صاحب نے اس تاریخ کے دونوں اشعار نقل کئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ رائیس نے ایپگرافیا کرناٹکا میں دونوں ابیات اصلی الفاظ کے ساتھ نقل کئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے یہاں سنگین کتبہ لگا ہوا تھا جس پر یہ دونوں ابیات کندہ تھیں۔ کسی قاضی صاحب نے اپنا آبائی حق جتلانے کے لئے اس کتبہ پر گارا لگوادیا اور اصلی اشعار میں ترمیم کرکے شیخ زمانہ کی جگہ قاضئ شہر لکھوادیا۔

اصلی اشعار یہ ہیں۔

شیخ زمانہ شیخ فرید آں کہ درسرا بہر صلوٰۃ کرد بنا خانہ خدا
در گوش عقل آمد از غیب ایں ندا بیت المقدس است بگو سال ایں بنا
۱۱۰۸ھ

محمود بنگلوری نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے اور اس مسجد کو مسجد شیخ فرید ہی لکھا ہے ان کا خیال ہے کہ شیخ فرید انجینیر اور معمار ہوں گے۔ جن کے نام سے یہ مسجد موسوم ہوگئی

محمود حسین صاحب تذکرۃ البلاد والحکام کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ آصف جاہ نظامت دکن کے زمانے میں رستم جنگ سرا کا صوبہ دار تھا۔ جس نے اس شہر کا نام بدل کر رستم آباد رکھا۔ رستم جنگ کا تذکرہ گزیٹیر نے بھی کیا ہے جس کا ذکر اگلے صفحوں میں آچکا ہے۔ اسی کی صوبہ داری کے دور میں ایک اور منصب دار شیخ فرید نے یہ مسجد تعمیر کروائی میر محمود حسین صاحب کرمانی کے اس بیان سے متفق ہیں اور اسی کو صحیح مانتے ہیں۔ بہر طور یہ اورنگ زیب کے زمانے کی تعمیر ہے اور اس کی تحریک تجویز اور تکمیل میں ان کا حصہ اور ذوق وشوق یقینی ہے [۱]

[۱] ریاست میسور میں عربی فارسی اور اردو کتبے از میر محمود حسین

شہر سرا میں یہ سب سے بڑی مسجد ہے جس کا رقبہ ۵۳،۴۴ × ۴۳ ۸۶۳ میٹر ہے۔ یہ عمارت بہت ہی دیدہ زیب عظیم الشان اسلامی طرزِ تعمیر کا نمونہ ہے۔ ماہرین تعمیرات نے بھی اس کی بہت تعریف کی ہے اور اسے اسلامی طرز تعمیر کے بہترین نمونوں میں شمار کیا ہے۔ ساری عمارت ایک ہی قسم کے پتھر میں بنی ہے۔ محراب منبر اور صدر دروازہ البتہ سنگ سیاہ میں بنے ہیں۔ امام کے محراب کے اوپر چھت پر تین گنبد ہیں درمیانی گنبد سنگ مرمر کا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی نمونہ کو سامنے رکھ کر بنگلور کی جامع مسجد پر بھی اسی طرح کے تین گنبد بنائے گئے ہیں۔ محراب کے دونوں بازوؤں میں دو چھوٹے چھوٹے محراب ہیں اس میں سنگین ستون ہیں۔ کہا جاتا کہ پہلے یہ ستون ہوا کے ساتھ ہی گول گھومتے تھے۔ آج بھی یہ ستون موجود ہیں ہاتھ سے پھرائیں تو پھرتے ہیں۔ منبر بھی سنگ سیاہ کا ہے منبر پر چھوٹے چھوٹے گنبد بنے ہیں وہ بھی سنگ سیاہ کے ہیں اور ان کو سیسہ سے جوڑا گیا ہے۔ پہلی صف کے درمیانی حصّہ میں محراب کے سامنے سنگ سیاہ کی بنی ایک زنجیر ہے جو چھت سے نیچے کی طرف آتی ہے۔ یہ زنجیر قندیل لٹکانے کے استعمال کی جاتی تھی۔ اس مسجد میں آٹھ ستون ہیں۔ انہیں ستون پر اندرونی کمانیں بنی ہیں۔ کمانوں کے درمیان چھت کے نچلے حصّہ میں نقش ونگار بھی ہے۔ بیرون مسجد پانچ سنگین خوبصورت کمانیں ہیں ہر کمان کے دونوں طرف پھول بنے ہیں۔ اندرون مسجد داہنے اور بائیں طرف اور مغربی دیوار میں بھی محرابیں بنی ہیں۔ مسجد کے دونوں کناروں پر ہشت پہلو ستون ہیں اور انہیں ستونوں پر بڑے مینار کھڑے ہیں۔ میناروں کے درمیان ایک چھوٹی دیوار بنی ہے چھت کے چاروں کناروں پر یہ دیوار یعنی پیاراپٹ ہے جن پر چھوٹے چھوٹے مینار ہیں اور اس دیوار کو کنگرے بنا کر سجایا گیا ہے۔ ان کنگروں کے نیچے جھمکے بنے ہیں۔ جس سے عمارت کی زیبائش بڑھ گئی ہے۔ مسجد کا صحن کشادہ ہے۔ درمیان میں ایک خوبصورت حوض ہے۔ حوض کے دائیں جانب ایک کنواں ہے۔ جس میں اترنے کے لئے سیڑھیاں بنی ہیں۔ ان سیڑھیوں پر بھی کمانیں

نمبر ۸

بنائی گئی ہیں اور دیواروں میں چھوٹے چھوٹے محراب ہیں اسی کنویں سے حوض کو پانی آتا ہے۔ مسجد کے داہنی طرف امام و موذن کے حجرے ہیں اور بائیں جانب ایک دالان ہے مسجد کے احاطہ کی دیوار میں ایک چھوٹا دروازہ ہے۔ اسی کے بائیں پہلو میں گنبد نما چھوٹی عمارت بنی ہے جس میں جنازہ رکھا جاتا ہے۔ اس کے بائیں جانب قدیم لحد (مزارات) ہیں بتایا جاتا ہے کہ حفاظ مسجد کی قبریں ہیں۔ دروازے کے داہنی جانب شیخ محی الدین صاحب کی قبر ہے جو سرا کی ایک مخیرؔ اور معروف شخصیت تھی جن کا انتقال ۱۹۴۸ء میں ہوا تھا۔

مسجد کے اطراف سنگین دیوار کا احاطہ بنا ہے دیوار کا سر کنگروں اور چھوٹے چھوٹے میناروں سے سجا ہے۔ احاطہ کی دیوار میں مشرقی جانب صدر دروازہ ہے جس کی چوکھٹ سنگ سیاہ سے بنی ہے۔ چوکھٹ اور اس کے اطراف نقش و نگار بنے ہیں۔ اس کا دروازہ بڑا ہے۔ جس کے دو پھاٹک ہیں دور سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ قلعہ کا دروازہ ہے۔ دروازہ میں داخل ہونے کے لئے تین طرف سے ۵ یا ۶ سیڑھیاں نیچے اترنا پڑتا ہے دروازہ میں داخل ہوتے ہی دونوں طرف وسیع و عریض دالان بنے ہیں ان کو بھی کمانوں سے سجایا گیا ہے۔

صدر دروازہ کی چھت پر دو بلند مینار ہیں۔ چاروں کونوں پر چار چھوٹے چھوٹے مینار ہیں۔ میناروں کے درمیان پیارا پٹ کو کنگروں سے سجایا گیا ہے۔ چھت کے نچلے حصے میں پتھر کے براکٹ بنے ہیں جن کو جھمکوں سے سجایا گیا ہے۔ صدر دروازے کے داہنی جانب سیڑھیاں ہیں جن سے گذر کر چھت پر جا سکتے ہیں۔ پہلے اسی جگہ چھت پر کھڑے ہو کر موذن اذان دیا کرتا تھا۔

قدیم سرکاری پروانے کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ صدر دروازہ اور احاطہ کی دیوار مسجد کی تعمیر کے بعد کی تعمیر ہے۔ صدر دروازہ کی پیشانی پر صدر دروازہ کی

تعمیر کی تاریخ لکھی ہوئی ہے۔ لیکن رنگ و روغن اور چونا چڑھانے کی وجہ سے یہ تاریخ دکھائی نہیں دیتی۔ مسجد کی آمدنی کے لئے بیرون مسجد دو کانیں ہیں۔ زمانہ قدیم میں اس مسجد کی آمدنی کے لئے ۱۲ر دو کانیں بنوائی گئی تھیں۔ نجیب خاں نے اپنے ایک حکم نامہ میں ان ۱۲ر دو کانوں کا محصول معاف کیا ہے۔ یہ دو کانیں مسجد کے احاطے میں واقع تھیں۔ نواب دلاور خاں نے اپنے ایک حکم نامہ میں مسجد کے حافظ محمد سعید کے گذر بسر کے لئے وظیفہ جاری کیا تھا جو منگل واد پیٹ دیہات کی آمدنی میں سے دیا جاتا تھا۔ اس مسجد کے لئے ایک امداد بھی جاری کی گئی تھی جس سے مسکین، فقراء، مسافر اور نکاح بندی کے اخراجات کے لئے دس روپیہ یومیہ مقرر تھا۔ مشہور خاں بہادر نے اپنی ایک دستاویز کے ذریعہ جو ۹ رجمادی الاوّل ۶ سنہ جلوس میں حافظ محمد شریف و خانداں خطیب جامع مسجد کی گذر معاش کے لئے تادیکیرے نمادر میں اپنی دعائے خیر کے لئے زمین عنایت کی تھی۔

ایک سرکاری پروانہ کی یہاں نقل دی جاتی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس مسجد کے ۱۲ر دو کانیں تھیں جو منصور بازار میں واقع تھیں۔ یہ سرکاری پروانہ شیخ فرید کے بارے میں بھی تفصیلی روشنی ڈالتا ہے۔ اس فارسی پروانہ کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔ (دیکھئے پروانہ نمبر ۱)

پروانہ بمہر ابوالحسن نائب صوبہ دار المظفر بیجاپور تعلقہ کرناٹک کے پرگنہ کے عملداروں اور زمینداروں کو معلوم ہونا چاہئے کہ ۱۲ر دو کانیں جو کہ قصبہ رُستم آباد میں جو کہ پرگنہ مذکور کے تحت ہیں اور جو شخصیت و رفعت پناہ شیخ فرید داروغہ داغ و تصحیحہ کے ہیں ان کی بنائی ہوئی مسجد کے احاطے کی دیواروں کے اندر واقع ہیں ان تمام کی آمدنی وزارت وعالی مرتبت شوکت اللہ خاں کے لئے مقرر ہے تاکہ مسجد کی روشنی کے لئے واگذار کریں۔

مطابق اصل است [illegible]

[illegible] الرحمن

پروانه ... ابوالحسن [illegible] وزارت و معالی پناه [illegible] از قرار [illegible]

[illegible] نوشته [illegible] مقرب الخاقان [illegible] سایر [illegible] میرالملک [illegible]

[illegible] دارالطیبه [illegible] بنابر [illegible] و [illegible] دکاکین [illegible]

[illegible] مذکور [illegible] دیوار مسجد [illegible] مسجد [illegible] پناه [illegible]

[illegible] [illegible] قاجار [illegible] ابد [illegible] حاصل [illegible]

[illegible] وزارت و معالی [illegible] مسجد [illegible] [illegible]

[illegible] مسجد [illegible] مدرسه [illegible] مطابق [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] فدوی [illegible] پناه [illegible]

[illegible] مسجد و مدرسه مذکور [illegible] الحق

[illegible] [illegible] اخراجات [illegible]

[illegible] مواظبت [illegible] تنبیه بلیغ [illegible]

[illegible]

[illegible]

خان معز اللہ خاں کے حکم نامے کے مطابق ان تمام دوکانوں کی آمدنی جن کا تعلق منصور بازار سے ہے۔ (یہ آمدنی) خلائق پناہ درگاہ کی روشنی اور مسجد اور خدمتگاروں کے لئے محصول معاف ہے۔ اس بارے میں سخت تاکید کی گئی ہے کہ کوئی بھی کسی طرح سے ان جگہوں کی آمدنی میں مانع اور مزاحم نہ ہو۔ تاکہ ضروریات مذکورہ پر اپنی ضروریات میں خرچ کرتے ہوئے ہمیشہ باقی رہنے والی دولت کے لئے دعا میں مشغول رہیں۔ اس میں سخت تاکید جانیں۔

ایسے حکم ناموں کے جاری ہونے کے باوجود ایک مخطوطہ بتاتا ہے کہ اس مسجد کی جائیداد کی قرقی ہوئی تھی۔ لیکن شنوائی کے بعد پھر واگذار کی گئی

ایک اور دستاویز سے پتہ چلتا ہے کہ مسجد کی آمدنی کے لئے ایک دیہات بھی وقف تھا۔ جس کی ساری آمدنی مسجد کے لئے ہوا کرتی تھی۔ مہاجی سیندانے اس کی آمدنی اپنے صرف خاص میں استعمال کی تھی۔ اور اس کی شکایت سرکار میں ہوئی تھی کہ حاکم مذکور نے مسجد کے حوالدار کو قید کیا۔ حافظ صاحب پر ظلم و ستم بھی کیا۔ یہ حاکم رشوت کھاتا تھا اور حاکموں کے حکم پر عمل نہیں کرتا تھا۔

ایک اور دستاویز بتاتی ہے کہ بن کونٹہ تعلق قریہ نہمن ہلّی تعلقہ مسجد معروف موضع مذکور میں مریم بی بی بنت شیخ فرید مرحوم کو بی بی شہر بانو نے اپنی خواہرزادی کے خرچ کے واسطے قریہ انعام کے طور پر عنایت کیا تھا۔ جسے انہوں نے ۱۱۶۳ھ اس کو رضا و رغبت قبول کر لیا تھا۔ یہ دیہات ان کے تصرف میں دیدیا گیا تھا۔ پیش گاروں و کاشت کاروں کو بھی اس بارے میں سخت تاکید کی گئی ہے۔ (دیکھئے پروانہ نمبر ۲)

ان سارے دستاویزات سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ فرید صاحب ایک منصب دار تھے جن کو بڑی تعظیم و تکریم کے ساتھ دستاویزات میں یاد کیا گیا ہے۔ وہ شیخیت و رفعت پناہ تھے اور داروغۂ داغ و نصبحہ بھی تھے۔ ان کی بنائی ہوئی مسجد کی آمدنی کے لئے ۱۲۱

مقدمان و مزارعان موضع نبد کوته تعلقه مجدداً معلوم نمایند

چون قریه نهمن حسیلی تعلقه موضع کورکه ... بنت شیخ فرید مرحوم به ... شهر بانو خواهرزاده‌ی خویش برای خرج بطریق انعام داده بودند بالان هم از ابتدای سال ۱۱۶۳ فصیلی برضا و رغبت خود قبول نمودیم و دادیم احیاناً اگر کسی از اولاد بایان دعوا کنند یا مزاحمت رسانند باطلست باید که دیه مذکور را مستقر ... دانند تحریر فی التاریخ ... سنه ...

[illegible]

پروانه نمبر ۳

دوکانیں تھیں۔ جن کا محصول ہر حاکم وقت نے معاف کیا تھا اور مسجد کے خرچ کے لئے انعامی زمینات بھی تھیں۔ مسجد کے خرچ کے لئے ایک حاکم نے یومیہ دس روپیہ دیا تھا تاکہ نکاح بندی، روشنی اور مسافروں کا خرچ چل سکے۔ اس مسجد کے ملازمین میں حافظ خطیب امام، موذن، جاروب کش کے ساتھ ساتھ حوالدار بھی تھا۔ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ شہر بانو شیخ فرید کی بہن تھیں۔ اور ایک بازار بھی موجود تھا جس کا نام منصور بازار رکھا گیا تھا۔ یہ بات بھی واضح ہوتی ہے مسجد کے انتظامی اُمور کے لئے ایک وزارت بھی مقرر تھی جس کے وزیر شوکت اللہ خان تھے اور شیخ فرید کی ایک بیٹی بھی تھیں جن کا نام مریم بی بی تھا۔

مسجد کے صدر دروازے کے داہنی جانب دو کتبے ہیں۔ ایک مسجد کا اور دوسرا کسی کی قبر کا۔ مسجد کا کتبہ دیوار میں نصب ہے۔ تاکہ گم ہونے سے محفوظ رہ سکے۔ یہ کتبہ کسی مسجد کا ہے۔ کتبہ میں مسجد کی تعریف و توصیف بہت زیادہ کی گئی ہے۔ کتبہ کی عبارت عربی زبان میں خط ثلث میں کندہ ہے۔ عبارت یہ ہے۔

بنی هذا المسجد الشریف الذی عرقد وجلت حریقیه

ومرتبته، علت یوم الجمعه فی سابع جمادی الاول سنه سبع

والفستین من الهجرة خلت ٥ ١٠٦٧ الهجریه

ترجمہ یہ ھے:۔ یہ مسجد شریف بنائی گئی۔ جس کی قدر و منزلت (شان) شمار کی گئی اور اس کی عزت علو مرتبت کو پہنچی۔ جمعہ کے روز ۷ رجمادی الاول ۱۰۶۷ھ میں مطابق ۱۶۵۶ء۔

میر محمود حسین صاحب "ریاست میسور میں عربی فارسی اور اردو کتبے"[1] میں لکھتے ہیں کہ یہ ریاست میسور کا پہلا عربی کتبہ ہے اس کتبہ میں جو توصیفی الفاظ استعمال ہوئے

---

[1] ریاست میسور میں عربی فارسی اور اردو کتبے ص ۱۴

ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑی عظیم الشان مسجد ہوگی۔ یہ کسی مسجد کا کتبہ ہے اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ شاید مسجد کے انہدام کے بعد یہ کتبہ حفاظت کی خاطر یہاں رکھ دیا گیا ہوگا۔ پتھر بوسیدہ ہو چکا ہے اور حروف مٹتے جا رہے ہیں۔ یہ کتبہ محمد عادل شاہ کے دور کا ہی اسی کتبہ کے ساتھ ایک اور کتبہ ہے اس کتبہ کا پتھر معمولی ہے۔ کتبہ کی عبارت یہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ محمد ابا بکر عثمان

حیدر باشا بن مہارت احمد خاں

۱۰۵۷ھ تیس ہفتم ۷ رمضان المبارک

میر محمود حسین صاحب کتاب مذکور ہیں لکھتے ہیں کہ" اس کتبہ میں کسی عمارت کا کتبہ کی تاریخ ہے جو ۱۵۹۸ء کے مطابق ہے" صاحب کتاب نے اس کتبہ کو کسی عمارت کا کتبہ بتایا ہے اور بانی عمارت کا نام احمد خان بتایا ہے۔ پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ یہ کسی عمارت کا کتبہ نہیں ہے کیونکہ سرا پر مسلمانوں کا قبضہ ۱۰۲۹ھ میں ہوا تھا۔ پتھر گھس گیا ہے اور عبارت مشکل سے پڑھی جا سکتی ہے"۔ [1]

میں نے اس پتھر پر لکھی ہوئی عبارت کو کوشش کر کے پڑھا ہے اور اسی کی عبارت اوپر لکھی ہے۔ شاید یہ کسی کی قبر کا پتھر ہے اور صاحب قبر کا نام حیدر باشاہ بن مہارت احمد خاں ہے۔ ہفتم رمضان المبارک ۱۰۵۷ھ میں انتقال ہوا ہے۔ کتبہ ہونے کی وجہ سے حفاظت کی خاطر یہ کتبہ یہاں لا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اگر اس کی عبارت سنگ سیاہ پر کندہ ہوتی تو شاید الفاظ کے گھس جانے کے باوجود کچھ نہ کچھ پڑھا جا سکتا تھا۔ جیسا کہ اوپر کا کتبہ ہے معمولی پتھر ہونے کی وجہ سے عبارت کا پڑھنا مشکل ہے۔

مسجد کے باہری کمانوں کے درمیانی حصّہ میں سنگ سیاہ نصب ہیں۔ اسی پر

---

[1] کتاب مذکور ص۱۵ بعنوان عمارات سرا

سفید رنگ سے سیدھے جانب عیدگاہ کے بنانے کی تاریخ ۱۶۳۸ء لکھی ہے درمیانی کمان میں مسجد شیخ فرید (جامع مسجد) کی تاریخ کا صرف آخری شعر ہے۔ بائیں کمان پر ملک ریحان کے روضہ کی تاریخ ۱۶۵۰-۱۶۳۸ء لکھا ہوا ہے۔ اس طرح جامع مسجد میں تین کتبے ہیں اور عیدگاہ کی تعمیر تاریخ بھی ملتی ہے۔ بہر حال سرا (رستم آباد) کی قدیم مساجد میں یہ سب سے عالی شان مسجد ہے جو آج بھی صحیح و سالم ہے۔ یہاں باقاعدہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کی جاتی ہے اس کی نگہداشت محکمہ آثار قدیمہ حکومت ہند کرتی ہے۔

مسجد احراری

یہ مسجد ملک ریحان کے مقبرے کے شمالی حصّہ میں واقع ہے اس مسجد کا رقبہ ۳۰×۲۳٫۲۶ میٹر ہے۔ اس مسجد کے چھت پر چار خوبصورت جالی دار مینار ہیں۔ یہ مسجد بھی کافی خوبصورت ہے۔ امام کے محراب کی پیشانی پر جلی نستعلیق

مسجد احرار سرا

حروف میں تعمیر مسجد کی تاریخ اور بانیٔ مسجد کا نام کندہ ہے لفظ بیت العتیق حق سے اس مسجد کی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ کتبہ کی عبارت یہ ہے

ہاتف ببانگ گفت پس از حمد و ثنا
بیت العتیق حق شدہ تاریخ ایں بنا
بانی ایں بنا نجیب خاں احراری

عبارت کا ترجمہ یہ ہے

حمد و ثنا کے بعد ہاتف غیب نے کشف کیا۔ اس بنیاد کی تاریخ بیت العتیق حق ہو گئی نجیب خاں احرار نے (یہ مسجد) بنوائی۔

تعمیر مسجد کی تاریخ ۱۱۳۱ھ ہے جو ۱۷۱۸ء کے مطابق ہے۔ میر محمود حسین صاحب کتاب مذکور میں لکھتے ہیں کہ رائیس نے ایپگرافیا کرناٹکا میں فقط بیت العتیق کے اعداد سے ۱۰۲۳ھ نکالا ہے اور یہ سراسر غلط ہے۔ اس وقت شاید نجیب خاں پیدا بھی نہ ہوئے ہوں گے۔ آصف جاہ نے اپنی نظامت دکن کے عہد کے زمانے میں نجیب خاں احراری کو سرا کا صوبہ دار مامور کیا تھا۔ آپ تین سال تک اس عہدے پر بحال رہے اور مرہٹوں کا بڑی بہادری سے مقابلہ کرتے رہے۔ یہ بڑی خوشنما مسجد ہے اور اب امتداد زمانہ کی وجہ سے کچھ بوسیدہ ہو چکی ہے۔ تذکرہ البلاد والحکام میں نجیب خاں احراری اور مسجد کا ذکر ملتا ہے[1]
میر محمود حسین صاحب نے نجیب خاں کے صوبہ دار ہونے کا جو تذکرہ کیا ہے، اس کا ثبوت ایک حکم نامہ سے بھی ہوتا ہے۔ جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے کہ ان کے دور حکومت میں مسجد شیخ فرید کے ۱۲ دو کانوں کا محصول معاف ہوا تھا۔

اس مسجد کی شمالی دیوار پر ایک اور کتبہ ہے جس پر یہ بیت جلی خط میں لکھی ہوئی ہے۔

از سعی واحد بیگ شد ایں مسجد خاں نجیب
صواب ایں از خدا در عاقبت گردد نصیب

ترجمہ یہ ہے

[1] کتاب مذکور ص

واحد بیگ نے اپنی کوشش سے اس مسجد خاں نجیب کو بنایا بلکہ یہ نعمت خدا نے اپنی مہربانی سے عاقبت میں نصیب کیا میر محمود حسین صاحب کا خیال ہے کہ شاید و احد بیگ اس مسجد کی تعمیر کے نگراں ہوں گے۔ پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ محمود خاں بنگلوری نے تاریخ جنوبی ہند میں لکھا ہے کہ ایک بڑی جاگیر اس مسجد سے متعلق تھی جو زوال سلطنت خداداد کے بعد ریاست میسور کے دیوان پورنیا نے ضبط کرلی۔ آج بھی اسی مسجد میں باقاعدہ نماز باجماعت ادا ہوتی ہے[1]

اس مسجد کے صحن میں کسی مسجد کا کتبہ رکھا ہوا ہے جس کی عبارت یہ ہے

بنی ھذا المسجد الشریف العظیم العالی المبارک

علی نظر الراجی غفور ربہ تابع الملک ریحان مبارک

علی اللہ عنھما بحق النبی الکریم وصلعم ولیس وتبارک

یہ کتبہ سنگ سیاہ پر خط ثلث میں کندہ ہے۔ اس مسجد کو ملک ریحان کے کسی ماتحت افسر نے بنایا تھا۔ معلوم نہیں یہ مسجد کہاں واقع تھی۔ میر محمود حسین صاحب نے کتاب مذکور میں تاریخ جنوب ہند کے حوالے سے لکھا ہے کہ محمود بنگلوری نے اسے قلعہ کے اندر کی مسجد کا کتبہ بتایا ہے۔ مگر اب جیسا کہ پہلے بھی اگلے صفحات میں لکھا جاچکا ہے کہ قلعہ میں کوئی عمارت نہیں ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ قلعہ کے درمیان میں جو عادل شاہی عمارتوں کے طرز کی عمارت کا صرف ایک حصّہ ہے جس میں چھوٹے چھوٹے محراب ہیں اور اس پر للّی کے پھولوں کے نشان بھی ہیں اور اسی ایک دیوار کے قریب ہی حوض بھی ہے شاید مسجد کے آثار ہی ہوں گے۔ لیکن گزیٹیر نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ شاید تعلقہ کچہری ہوگی مگر اس کے آثار دیکھتے ہوئے میرا خیال ہے کہ یہ مسجد ہی ہوگی

مسجد احراری کا ایک عیدگاہ ملک ریحان کے مقبرہ کے بازو میں ہے۔ اس کا مدرسہ بھی ہے اور ایک یتیم خانہ بھی۔

---

[1] کتاب مذکور ص

مسجد برکی سرا کے شمالی حصہ میں ایک مسجد ہے جو بالکل شکستہ حالت میں ہے۔ مسجد کے احاطے میں مقبرے ہیں۔ ان میں سے ایک مقبرے میں ریت بھری ہے۔ دوسری قبر بھرتی ہے۔ گزیٹیر نے اس عمارت کی بہت تعریف کی ہے۔ اس مقبرے کو تر کی طرز تعمیر کا بہترین نمونہ قرار دیا ہے۔ آج بھی یہ مقبرہ صحیح وسالم ہے۔ اس پر جو رنگ وروغن لگایا گیا تھا اس کے بھی کچھ کچھ نشانات باقی ہیں۔ مسجد کے احاطے کے باہر بھی چند مقبرے ہیں۔ جو شاندار عمارتوں کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ امتداد زمانہ کی وجہ آہستہ آہستہ مٹتے جا رہے ہیں۔ مسجد کے احاطے میں بھی قبریں ہیں

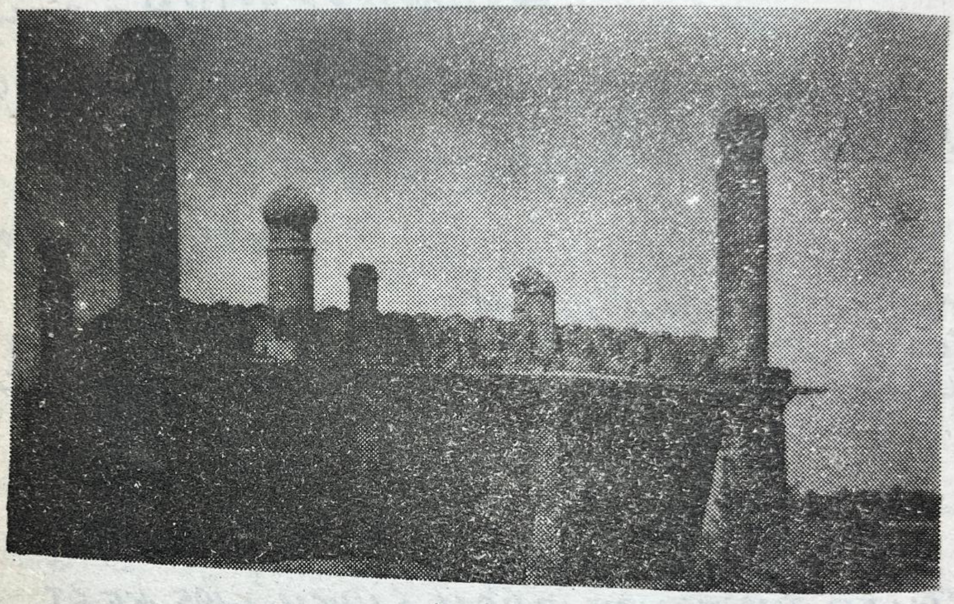

مسجد برکی

اس مسجد میں محراب کی پیشانی پر ایک کتبہ ہے جس کی عبارت نہایت عمدہ نفیس نستعلیق خط میں سنگ سیاہ پر کندہ ہے۔ عبارت یہ ہے

خدا ابا ابن امان سلامتے
اسمٰعیل ابن قادر خاں برکے
سنہ ۲۰۱۱ ایں بوستان

ابن جمال ابن مصوہی ابن علی ابن خمار

کتبہ میں جو تاریخ سنہ ھ میں لکھی ہوئی ہے وہ دائیں سے بائیں کی طرف ہے یعنی ۱۱۰۲ھ مطابق ۱۶۹۰ء۔ یہ مسجد اور مقبرہ وغیرہ مغلیہ دور کے ابتدائی سالوں میں تعمیر ہوئے ہیں۔ میر محمود حسین صاحب کتاب مذکور میں تاریخ فرشتہ حصّہ دوم کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "برکی امرائے بیجاپور عادل شاہی دور میں بڑی اہمیت کے مالک تھے۔ بڑے جری اور بہادر مجاہد تھے۔ ان کا فوجی دستہ چھ ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ پہلے بت پرست تھے۔ بعد میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ بہت سے معرکوں میں اپنے جوہر دکھائے۔" [۱]

برکی خاندان کے افراد اب بھی یہاں موجود ہیں۔

میرا خیال ہے کہ یہ مسجد کا کتبہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ باغ کا کتبہ ہے کتبہ کی عبارت کا ترجمہ کیا جائے تو اس طرح ہوتا ہے۔

اے خدا ابن امان سلامت رہے۔ اسمٰعیل بن قادر خان باغ والے ۱۱۰۲ھ میں یہ باغ بنایا جن کا رشتہ خمار کے بیٹے علی، علی کے بیٹے مصر عی اور مصر عی کے بیٹے جمال سے تھا۔

میسور گزیٹیر نے بھی اس باغ کا تذکرہ کیا ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ :-

"A FINE GARDEN WAS ALSO LAID OUT CALLED THE KHAN BAGH, WHICH WAS KEPT BY HAIDER AND MAY HAVE SUGGESTED THE LAL BAGH GARDEN AT BANGALORE." [۲]

جس باغ کا تذکرہ گزیٹیر نے کیا ہے اس کا ثبوت تعلق آفس کے ریکارڈس میں بھی ملتا ہے۔ خان باغ کی زمین کا سروے نمبر ۱۹ ہے۔ پہنی (R.T.C) کے کالم نمبر دس میں اسکو انعام بتایا گیا ہے۔ یہ انعام (جاگیر) قادر خاں کے نام سے جاری تھا۔ اس کا رقبہ ایک ایکڑ

---

[۱] کتاب مذکور ص ۲۲ [۲] PAGE 599 MYSORE STATE GAZETTEER (TUMKUR DIST)

بارہ گنٹے ایک ایکڑ چوبیس گنٹے ہے جملہ دو ایکڑ چھتیس گنٹے۔ اسی زمین بابت لینڈ ٹریبونل کیس نمبر Case NO 259/77.78 اور LRM INA/246/79-80 میں یعقوب خاں بن باقر خاں زمیندار و مجاور ساکن سرانے حلفیہ بیان دیا ہے کہ

AS REGARDS SURVEY NO 19 it IS IN THE MIDDLE OF THE TOWN AND IT IS NOT CULTIVATED FROM THE TIME OF MY GRAND FATHER AS THERE ARE NUMBER OF HUTS AND HOUSES ON THE LAND AND THE WELL WHICH WAS SITUATED ON THE LAND HAS ALSO CAVED IN

حلفیہ بیان کے مطابق اس باغ کا کل رقبہ دو ایکڑ ۳۶ گنٹے تھا اور اس میں ایک کنواں بھی تھا جس سے باغ کی سیرابی ہوتی تھی۔ یعقوب خاں کے بیان کے مطابق اس زمین کو ان کے دادا پر دادا کے زمانے سے بھی جوتی نہیں گئی۔ یہ زمین شہر کے بیچوں بیچ واقع ہونے کی وجہ سے اور شہر کے پھیلنے کی وجہ سے یہاں جھونپڑیاں ڈال لی گئیں اور اب تو پختہ مکانات بھی تعمیر ہو چکے ہیں۔ کنواں بھی منہدم ہو چکا ہے۔ اب اس کا نام و نشان تک باقی نہیں ہے۔ شاید یہ کتبہ اسی باغ کے بناتے وقت لکھا گیا تھا اور اس باغ کے بنانے والے اسمٰعیل بن قادر خاں باغ والے تھے۔ ممکن ہے انہوں نے مسجد بھی تعمیر کی ہو۔ عمائدین شہر کا بیان ہے کہ ایک فقیر اس کتبے کو چرا کر لے جا رہا تھا لیکن بروقت اس کو پکڑ لیا گیا۔ اور پھر یہ کتبہ اسی جگہ نصب کر دیا گیا۔

مسجد سدّی مختار

شہر کے شمالی حصہ میں پاؤ گڈھ کے راستے پر ایک قریہ ہے جس کا نام وڈج گنٹہ ہے۔ اس قریہ میں داخل ہونے کے لئے مین روڈ سے مشرق کی طرف ایک کچا راستہ ہے چند قدم کے فاصلے پر یہ مسجد واقع ہے

مسجد کے سامنے ایک خوبصورت زنانہ مقبرہ بھی ہے۔ میر محمود حسین صاحب اپنی کتاب مذکور میں اس مسجد کے کتبہ کی نقل اتاری ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

سنہ ۱۰۱۱ھ

لیکن یہ کتبہ اب اس مسجد میں نہیں ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ اس میں یہ عبارت نہایت نفیس خط میں کندہ ہے۔ سنہ تعمیر ۱۱۰۱ھ مطابق ۱۶۸۹ء ہے۔ محمود بنگلوری نے اس مسجد کو مسجد سدّی مختار لکھا ہے۔ آج بھی یہاں اس کو اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ بہر طور یہ مسجد اور مقبرہ دونوں مغلیہ دور کے ابتدائی سالوں میں تعمیر ہوئے ہیں۔ اس کتبے میں سنہ ہجری کے اعداد دائیں سے بائیں کو لکھے گئے ہیں۔ اب یہ مسجد ویران پڑی ہے۔

مغل مسجد شہر سرا کی یہ بھی ایک قدیم مسجد ہے۔ اس مسجد کا اصل نام مسجد نظام الدین تھا۔ ایک زمانے تک یہ مسجد ویران پڑی تھی

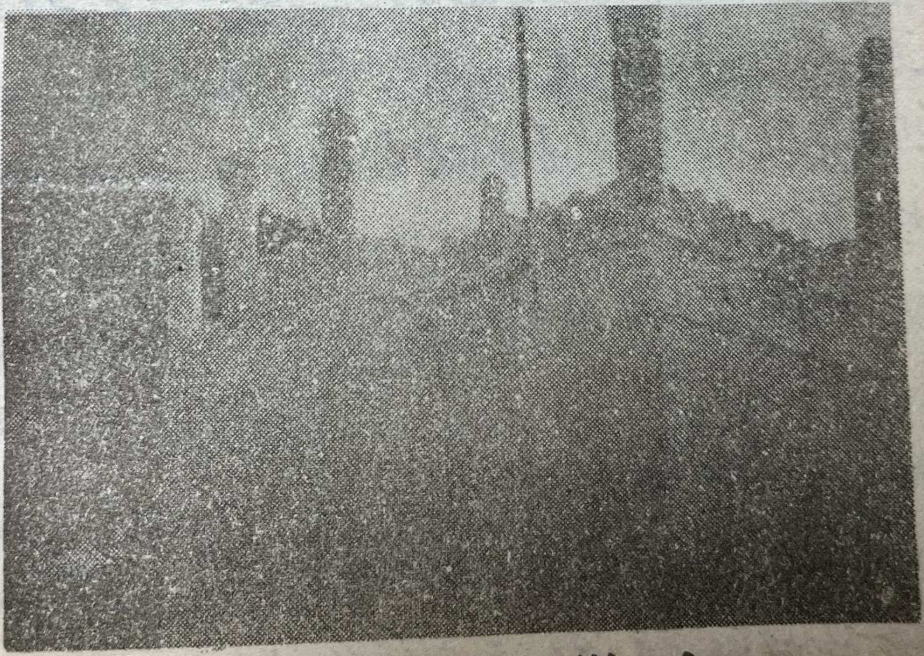

مسجد نظام الدین

، حسن بیگ نامی ایک شخص نے اس مسجد کو پھر آباد کیا اسی لئے اس کا نام مغل مسجد پڑ گیا ہے۔ اب یہاں بھی باقاعدہ نماز ادا ہوتی ہے۔ اس مسجد کا رقبہ ۲۴-۵ گنٹے ہے مونسپل اسسمنٹ نمبر ۱۷۰۱ ہے

بیگم مسجد

یہ مسجد چھوٹی ہے۔ ملک ریحان کی درگاہ کے قریب واقع ہے۔ یہاں کوئی کتبہ نہیں ہے۔ روایت ہے کہ ملک ریحان کے زمانے میں عورتوں کو نماز باجماعت ادا کرنے کے لئے تعمیر کی گئی تھی۔ یہ مسجد بھی قدیم مسجدوں میں سے ایک ہے۔ یہاں بھی نماز باجماعت ادا کی جاتی ہے۔

دلاور خان مسجد

یہ مسجد B.D.O آفس کے سامنے ہے۔ اس مسجد کا شمار بھی قدیم مساجد میں ہوتا ہے۔ اس مسجد کے چاروں طرف قبرستان پھیلا ہوا ہے۔ مسجد کے مغربی حصے میں ایک چبوترے پر بہت سی پختہ قبریں ہیں۔ دائیں جانب دو احاطوں میں قبریں ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ درگا قلی خاں کے فرزند میر کمال الدین کا مزار ہے اس قبر کے اطراف احاطہ کو منقش بنایا گیا ہے۔ جس میں جالیاں اور کمان بنے ہیں۔ مسجد کے بائیں بازو میں عبد القادر کا مقبرہ ہے۔ یہ بھی قدیم مقبروں میں شمار ہوتا ہے۔ اسی قبرستان کے وسیع علاقہ میں الگ الگ احاطہ بنے ہیں جن میں الگ الگ خاندانوں کے قبریں ہیں۔ پتہ نہیں یہاں کون کونسے خاندان آباد ہیں۔ ان کا طرز تعمیر ثابت کرتا ہے کہ یہ قدیم زمانے میں تعمیر ہوئے ہیں۔

اس مسجد کے مغربی حصہ میں شہر کا سب سے قدیم اور سب سے عظیم الشان عیدگاہ ایک چٹان پر بلند مقام پر دکھائی دیتا ہے۔ اس عیدگاہ کی تعمیر کا سال ۱۶۳۸ء ہے۔ یعنی عادل شاہی دور میں جبکہ ملک ریحان یہاں کے صوبہ دار تھے۔ اس کی تفصیل اگلے صفحات میں آئے گی۔ اس مسجد کے آگے ایک تھیٹر بنا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اس جگہ پر دلاور خان کا محل مع قلعہ بنا تھا۔ امتداد زمانہ کی وجہ سے اب اس کے آثار باقی نہیں رہے۔ اس کی بنائی ہوئی صرف مسجد

باقی ہے

تھیٹر کے پچھلے حصّہ میں ایک تالاب ہے۔ یہ تالاب قدیم تالابوں میں شمار ہوتا ہے اس تالاب کو جاجو کنڈ کہتے ہیں۔ اس کا اصل نام جہازبی کا کنٹہ ہے (کنٹہ تالاب کو کہتے ہیں) کسی خاتون نے ایصالِ ثواب کی خاطر یہ تالاب بنوایا تھا۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ شہر کے تالاب سوکھ جائیں اس میں کچھ نہ کچھ پانی ضرور موجود رہتا ہے۔

عیدگاہ سرا

جیسا کہ پچھلے صفحات میں تذکرہ کیا جا چکا ہے کہ یہ عیدگاہ شہر کے مغربی حصّہ میں موجود ہے۔ ساری قدیم عمارتوں میں یہی ایک عمارت سب سے بلند اور عظیم الشان ہے۔ شاید ریاست کرناٹک میں ایسا عیدگاہ دیکھنے میں آیا ہو۔

اس کی دیوار ۷۰ فیٹ لمبی اور ۱۰ فیٹ موٹی ہے جس میں ۷ محرابیں ہیں۔ دیوار کے اوپری حصہ کو کنگروں اور چھوٹے چھوٹے گنبدوں سے مزین کیا گیا ہے۔ دیوار کے دونوں کناروں پر دو بلند مینار ہیں۔ ان میناروں کے نچلے حصّے مربع اور موٹے ہیں اور آخری سرے ہشت پہلو اور کوتاہ

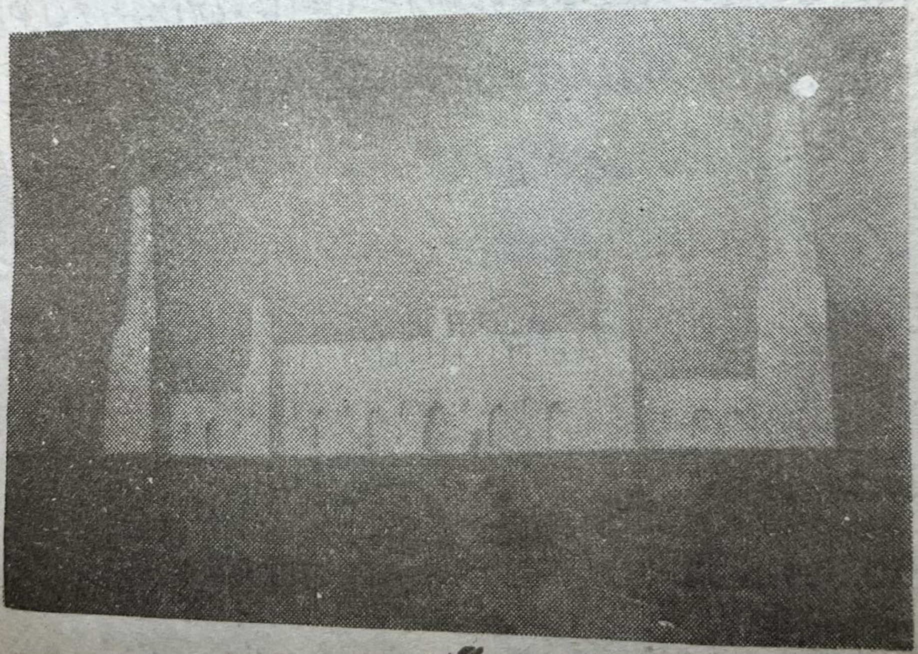

عیدگاہ سرا

ہیں۔ یہ مینار تقریباً ۴۰ فٹ اونچے ہیں۔ میناروں کے آخری حصّہ میں گنبد بنے ہیں۔

یہ عادل شاہی طرز تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔

مکان مسجد یہ مسجد ملک ریحان کے درگاہ (روضہ) کے مغربی حصہ میں واقع ہے۔ اس مسجد کو ملک ریحان نے اپنی دوران حیات تعمیر کروایا تھا۔ اس مسجد کے کوئی مینار نہیں ہیں محراب کے اوپر ایک گنبد بنا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے پہلے مقبرہ تعمیر کروایا پھر اس مسجد کی تعمیر چل رہی تھی کہ آپ اس دار فانی سے کوچ کر گئے اور مسجد کا کام ادھورا رہ گیا۔ یہ بھی عادل شاہی طرز تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ بڑی دیدہ زیب مسجد ہے یہاں بھی نماز باجماعت ادا ہوتی ہے۔

نئی مسجد جہاں مسجد کا ذکر آگیا ہے تو اس مسجد کا تذکرہ بھی بیجا نہ ہوگا۔ اس کی تعمیر کوئی ۷۰ یا ۸۰ برس پہلے ہوئی تھی۔ یہ مسجد بھی سنگین ہے۔ چھت پر ایک گنبد ہے اور

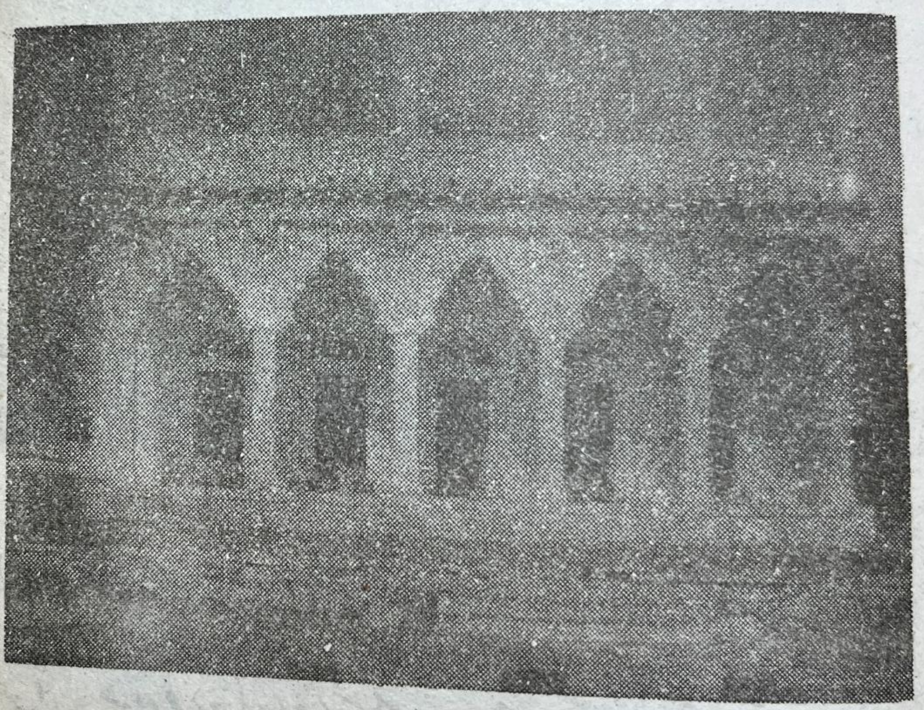

نئی مسجد

چھت کے چاروں کناروں پر چھوٹے چھوٹے مینار بنے ہیں۔ مسجد کے بڑے مینار نہیں ہیں۔ اس

مسجد کا رقبہ ۴۲٫۷ × ۴۴ × ۸ ۶٫۴۶ میٹر ہے. کافی کشادہ صحن ہے۔ خوبصورت حوض بھی بنایا گیا ہے
کہا جاتا ہے کہ قدیم زمانہ میں یہاں ۵۲ مساجد تھے ۔ اس مسجد کی تعمیر ہونے پر ۵۳ مسجد ہوتے
ہیں. یعنے یہ ۵۳ ویں مسجد ہے. اس کا ایک مدرسہ بھی ہے ۔

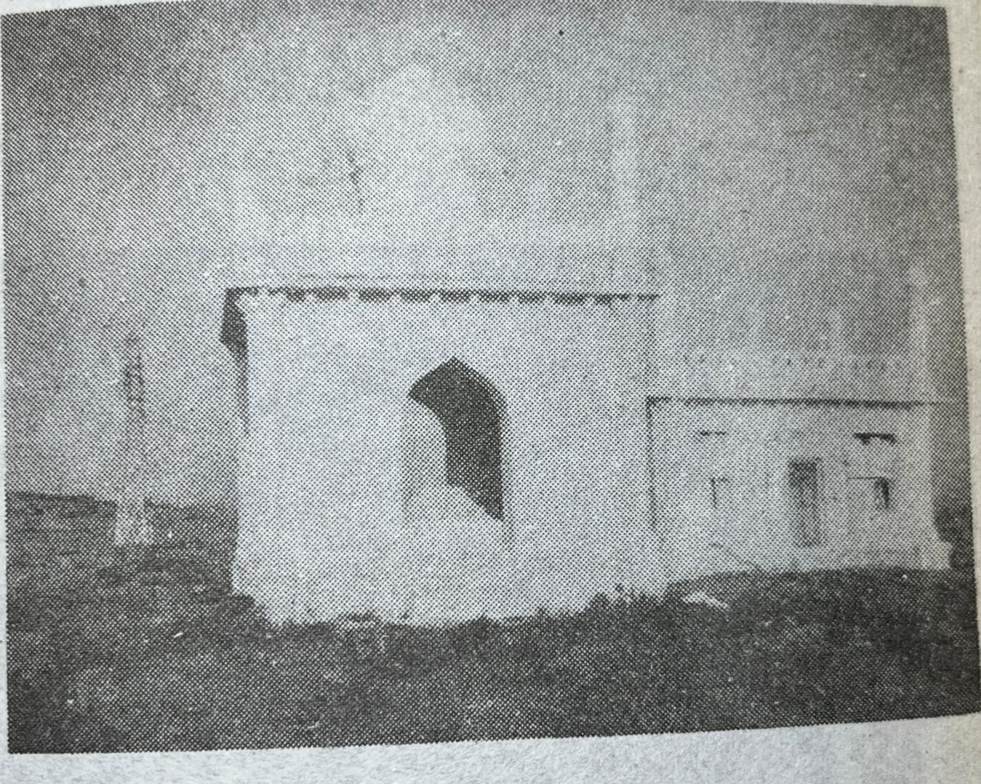

دلاور خان کی مسجد و مقبرہ عبدالقادر

فوٹو ۔ دلاور خان کی مسجد و مقبرہ عبدالقادر .

مقابرِ اولیائے سرا

روضۂ ملک ریحان

ملک ریحان کا مقبرہ ۴۰ رفٹ بلند مربع عمارت ہے۔ یہ عمارت ایک چبوترے پر کھڑی ہے۔ اس عمارت میں داخل ہونے کے لئے روضہ کے چاروں سمت آٹھ دس سیڑھیاں ہیں۔ مقبرے کے چاروں طرف محراب بنے ہیں۔ دیوار کے درمیانی محراب میں چاروں سمت دروازے نصب ہیں۔ مغربی دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ باقی دروازے بند رہتے ہیں۔ البتہ عرس کے موقع پر چاروں دروازے کھلے رہتے ہیں۔ عمارت کے وسط میں ملک ریحان کی مزار ہے۔ مقبرے کے چاروں طرف کشادہ دالان ہے۔ دالان کو کمانوں سے گھیرا گیا ہے۔ جس سے مقبرے کی خوبصورتی بڑھ گئی ہے۔ دالان کی چھت نیچی ہے۔ چھت کے چاروں طرف پیاراپٹ بنا ہے جس کو کنگروں سے سجایا گیا ہے۔ پیاراپٹ کے چاروں کونوں پر چار سنگ سیاہ کے مینار ہیں جو تقریباً ۸ رفٹ اونچے ہیں۔ مزار کے اوپری حصّہ پر بڑا گنبد ہے گنبد کے چاروں طرف چار مینار ہیں۔ ان میناروں کے درمیان کنگرے بنے ہیں۔ گنبد کا حصّہ اونچا ہے جس سے مقبرے کی خوبصورتی میں اضافہ ہوگیا ہے۔ ساری مقبرے کی عمارت منقش ہے۔ پیاراپٹ کے نچلے حصّہ میں چھجا ہے اور اس چھجے کے نچلے حصہ میں جھلگے بنے ہیں۔ کمانوں کے درمیان پھول بنے ہیں۔ مقبرے کا اندرونی حصّہ بھی کافی دیدہ زیب ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ مقبرے کی تعمیر ملک ریحان نے اپنی حیات میں ہی کروائی تھی جبکہ وہ (۱۶۵۰-۱۶۳۸ء) صوبہ دار تھے۔ ساری عمارت سنگین ہے۔ اس عمارت میں چھوٹے بڑے کھردرے پتھر مستعمل ہوئے ہیں۔ میناروں کے لئے سیاہی مائل نیلے پتھر استعمال کئے گئے ہیں۔ مقبرے کے مغربی حصّہ میں مسجد ہے جس کا ذکر مکان مسجد کے تحت پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے

روضہ ملک ریحان

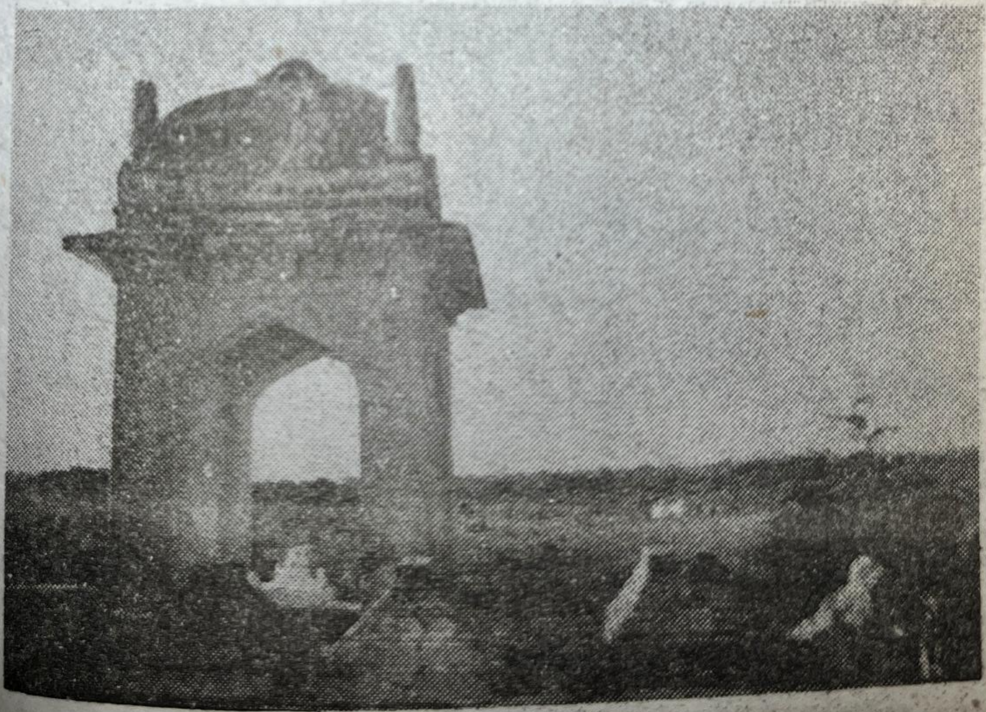

مقبرۂ گوہر تاج

شمال مشرقی جانب ایک اور عمارت ہے جس کو ڈڈی کہا جاتا ہے اس کی چھت پر چار مینار ہیں سامنے والے مینار پچھلے میناروں کی بہ نسبت اونچے اور منقش ہیں۔ گزیٹیر نے اسے ملک ریحان کا دار المطالعہ بتایا ہے اور مقامی حضرات اسے ملک ریحان کی چلہ کشی کا مقام بتاتے ہیں

میر محمود حسین صاحب نے کتاب مذکور میں ملک ریحان کے مقبرے کے کتبے کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ "اس کا ذکر رائس نے ایپگرافیا کرناٹکا میں کیا ہے۔ محمود بنگلوری نے بھی تاریخ جنوبی ہند میں اس کی نقل کی ہے۔ مگر باوجود سعی و کوشش کے سرا میں اس کا سراغ نہ لگا سکا۔ رائس نے اسے کتبہ بتایا ہے۔ اور محمود بنگلوری نے لکھا ہے کہ یہ تاریخیں ایک قدیم کاغذ میں نظر سے گذریں[1] کتبہ کی عبارت کا مفہوم پچھلے صفحات میں ملک ریحان کے حالات کے تحت آچکا ہے۔ پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "مقبرے کی عمارت بڑی شاندار اور خوبصورت ہے۔ چاروں طرف چھوٹے چھوٹے مقبرے اور بڑی چھوٹی قبریں ہیں۔ مقبرہ، مسجد اور اکثر قبریں سیاہی مائل نیلے پتھر سے بنی ہیں۔ یہ مقبرہ سرا میں اسلامی طرز کی خوبصورت عمارت ہے اور اخلاقی طرز کے بہترین نمونوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

ملک ریحان کا عرس ہر سال رجب کے مہینے میں بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے جس میں ہر قوم کے افراد بلا تفریق مذہب و ملت اعتقاد کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ عرس کے موقع پر نقارہ بھی بجایا جاتا ہے۔ اور گنبد پر سفیدی بھی چڑھائی جاتی ہے

مقبرہ گوہر تاج

اورنگ زیب کی دختر گوہر تاج کی قبر ملک ریحان کے مقبرہ کے جنوبی حصہ میں موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس مقبرے سے متعلق ایک بڑی جاگیر تھی لیکن سلطنت خداداد کے زوال کے بعد ضبط کر لی گئی۔ اب صرف ڈھائی ایکڑ زمین رہ گئی ہے۔ اس مقبرے میں نہایت چھوٹی سنگ سیاہ سے بنی ایک مزار ہے جس کے سرھانے یہ کتبہ لگا ہے

[1] کتاب مذکور ص ۱۶

اللہ
محمد

(۱۱۰۴ھ مطابق ۱۶۹۲ء)

اس قبر پر خوبصورت گنبد بنا ہے۔ جس کے چاروں طرف کمانیں ہیں اور ان میں لوہے کی کڑیاں لگی ہیں۔ محمود حسین صاحب اپنی کتاب مذکور میں تاریخ جنوبی ہند کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "چاروں طرف بازوؤں پر مخمل اور کمخواب کے پردے پڑے رہتے تھے تاکہ نامحرم کی نظر نہ پڑنے پائے۔ یہ قبر اورنگ زیب کی سات سالہ دختر گوہر تاج کی بتائی جاتی ہے جنکا انتقال شہنشاہ کے قیام دکن کے زمانے میں ہوا تھا۔"[1] اس بیان سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ شہنشاہ اورنگ زیب نے سرا میں بھی قیام کیا تھا۔

مقبرہ احاطہ مقبرہ ملک ریحان ملک ریحان کے مقبرے کے احاطے میں ایک نہایت ہی نفیس قبر سیاہ پتھر کی موجود ہے اور اس پر چاروں طرف چار کمانیں اسی سیاہ پتھر کی نہایت خوبصورت بنی ہیں ایک محراب جو مغربی جانب ہے اس کی پیشانی پر نہایت نفیس خط ثلث میں یہ کتبہ کندہ ہے

رحل سلطان بلیلۃ المعراج

۱۲۰۶ ۱۲۰۶

قبر اور کمانیں دونوں منقش اور مزین ہیں اور سنگین نقاشی کا بہترین نمونہ ہیں۔ معلوم نہیں صاحب قبر کون تھے۔ شاید سلطان صاحب قبر کا نام ہوگا۔ ان کی وفات ۱۲۰۶ھ کی شب معراج یعنی ۲۷ رجب کو واقع ہوئی مطابق ۱۷۹۱ء۔ عبارت بہت بلیغ اور پر معنی ہے[2]

قبر احاطہ مقبرہ ملک ریحان مقبرہ ملک ریحان کے احاطے میں مغربی جانب سیاہ پتھر سے بنی ہوئی ایک نہایت خوبصورت قبر کے چاروں

[1] کتاب مذکور صد ۲۶
[2] کتاب مذکور صد ۷۹

طرف کناروں پر نہایت نفیس خط ثلث میں قرآن مجید کی آیت جو آیۃ الکرسی ہے کندہ ہے معلوم نہ ہوسکا کہ صاحب قبر کون ہیں

ملک ریحان کی درگاہ کے چاروں طرف وسیع و عریض قبرستان پھیلا ہوا ہے۔ اس قبرستان کو مٹی کے دیواروں سے گھیرا گیا ہے۔ دیواروں کا کچھ حصہ باقی ہے اور کچھ حصہ منہدم ہو چکا ہے۔ اس درگاہ میں داخلے کے لئے شمال مشرق جانب احاطہ میں بارہ فٹ کی جگہ چھوڑی گئی ہے جس کے دونوں کناروں پر دو سنگین کھمبے ہیں۔ اس سنگین کھمبوں میں ایک طرف انگریزی میں کتبہ نصب ہے۔ جس پر ملک ریحان درگاہ لکھا ہوا ہے۔

فریداللہ شاہ حسینی کی درگاہ المعروف بہ سونے کے کلس کا مکان

فریداللہ شاہ حسینی ایک جلالی فقیر ہیں۔ بیجاپور سے آنے والے اولیاء میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ امین الدین اعلیٰ کے مرید تھے۔ تبلیغ کے سلسلے میں سرا آئے۔ آپ بابا فخرالدین

پنگنڈہ کے ہم عصر اور ساتھی تھے۔ جیسا کہ بتایا جاتا ہے کہ ان مریدین کو جہاں تبلیغ کے لئے بھیجا ہوتا ان کے مرشد ان کو ایک ایک نشانی دے دیتے تھے۔ بابا فخرالدین کو یہ نشانی دی گئی تھی کہ آپ کی مسواک کو ہر رات اپنے سرہانے لگائیں۔ اور یہ دیکھیں کہ علی الصبح اس میں پتے نکل آئے ہیں یا اس میں کونپل آئے ہیں۔ اگر نکل آئیں تو سمجھئے کہ آپ کی تبلیغ کا وہی مقام ہوگا۔ چنانچہ آپ اپنے مرشد کے قول پر سفر میں ہر رات عمل کرتے۔ ہر صبح اپنی مسواک دیکھتے کہ آیا میرا مقام ملا بھی یا نہیں۔ اگر کونپل نہ نکل آئے تو آپ اپنا سفر جاری رکھتے۔ چنانچہ جب آپ پنگنڈہ پہنچے تو آپ کی مسواک میں کونپل نکل آئے آپ نے وہیں مقام کیا۔ اور تبلیغ کرتے رہے۔ اسی طرح روایت ہے کہ فریداللہ شاہ حسینی نے سرا میں مقام کیا۔ آپ کی نشانی یہ تھی کہ آپ کے پاؤں میں لوہے کی بیڑی ڈالی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ یہ بیڑی جہاں اپنے آپ کھل جائے گی وہیں آپ کا مقام ہوگا۔ جب آپ سرا پہنچے تو آپ کی یہ بیڑی کھل گئی تو آپ سرا میں مقام کر گئے۔ آپ کے ساتھ ان کے بھانجے معصوم علی شاہ بھی تھے۔ یہ چھوٹا سا قافلہ جس میں بابا فخرالدین بھی ساتھ تھے فریداللہ شاہ حسینی کو سرا میں چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ چلتے چلتے آپ نے اپنے ماموں سے یہ کہا کہ ماموں جان آپ سے مجھ کو بہت عقیدت تھی اور میں آپ سے بہت محبت بھی کرتا تھا اور چاہتا ہوں کہ مرنے کے بعد بھی چاہتا ہوں کہ آپ ہی کے ساتھ رہوں۔ چنانچہ جب تبلیغ کا کام ختم ہوا تو سرا واپس آئے اور اپنے ماموں کے پہلو میں ہی انتقال کے بعد دفن ہوئے اس مقبرہ میں دونوں کی قبریں موجود ہیں۔

فریداللہ شاہ حسینی کو جاگیر میں زمین بھی دی گئی ہے۔ یہ زراعت بھی کراتے تھے شاہ محمد شاہ صاحب ووج گنڈہ والوں سے ان کی بڑی دوستی تھی۔ دونوں میں بڑی گاڑھی دوستی تھی۔ جب کبھی فریداللہ شاہ صاحب چلّہ کشی میں مصروف ہوتے شاہ محمد صاحب ان کی کھیتی باڑی اور زراعت سنبھال لیتے تھے۔ ایک مرتبہ شاہ محمد صاحب نے فریداللہ شاہ صاحب سے پوچھا یہ اوراد و وظائف اور چلّہ کشی کیا چیز ہوتی ہے۔ مجھے بھی سکھاؤ

فرید اللہ شاہ صاحب نے کہا کہ اس مرتبہ چلّہ کشی کے بعد انشاء اللہ ضرور سکھا دوں گا۔
ابھی وہ چالیس دن کا چلّہ ختم کر کے اٹھے تھے کہ کیا دیکھتے ہیں کہ لوگ جنازہ لئے آرہے ہیں۔
آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کسی کا جنازہ ہے۔ مگر لوگ ڈر کے مارے زبان نہیں کھول پا رہے
تھے اور یہ بھی نہ بتانا چاہتے تھے کہ آپ کے دوست کا انتقال ہوگیا ہے۔ جب آپ نے رعب اور
اصرار کے ساتھ پوچھا تو لوگوں نے حقیقت بتائی۔ تو آپ نے اپنے دوست کا جنازہ اپنے پاس منگوایا
ور خدا سے دعا کی کہ اے رب العزت پاک پروردگار میں اپنے دوست کو میری ہی طرح ولایت
کا درجہ دلانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کا موقع فراہم نہ ہو سکا۔ بہتر ہے کہ میری عمر میں سے میرے
دوست کو پانچ سال کی عمر دیدے۔ چنانچہ آپ کی دُعا قبول ہوئی پھر ان کے دوست زندہ ہوئے۔
پانچ سال تک دونوں نے جو کچھ حاصل کرنا تھا کیا۔ پھر ٹھیک پانچ سال بعد دو ج گنٹے والے شاہ
محمد شاہ صاحب کا انتقال ہوا۔ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ آپ کے کرامات میں سے آپ کی دعائیں
قبول ہوتی تھیں۔ آپ دعا کے لئے مشہور تھے۔

انہیں کے خاندان میں سے ایک اور ولی حضرت خاکی شاہ جن کا مزار میسور میں خاکی شاہ
کی مسجد میں ہے۔ آپ اسی خاندان سے ہیں۔ زمینات ورثہ میں ملی تھیں۔ کھیتی باڑی کے
کام میں مصروف رہتے اور اس کے ساتھ ساتھ اوراد و وظائف میں مشغول رہتے تھے۔
ان کا روزانہ معمول تھا کہ نماز فجر کے بعد گھر سے زمینات کی طرف آتے۔ ایک غیر قوم کی عورت
کا یہ معمول تھا کہ علی الصبح نماز فجر سے پہلے ان کے کھیت سے چارہ کاٹتی اور رات بھر کے گرے
ہوئے پھل لکڑیاں جمع کر کے لیجاتی ایک دن کا واقعہ ہے کہ وہ ذرا دیر سے پہنچی اور اپنا کام
(چوری) کرنے کے بعد واپس ہو رہی تھی کہ خاکی شاہ کے ہاتھوں پکڑی گئی۔ آپ نے چارہ
اور لکڑی کا گھٹرا اتار لیا اور پوچھا کہ اس چوری کی سزا کیا دینی چاہئے اور یہ چوری کب اور
کتنے دنوں سے کی جا رہی تھی۔ اس نے ڈر کے مارے سارا ماجرا بیان کیا کہ ہر روز کا یہ میرا
معمول تھا کہ اور میں کئی دنوں سے یہ کام کر رہی تھی۔ آپ نے اس کے پاس سے درانتی بھی

لے لی۔ اس عورت نے بڑی معذرت کی اور آئندہ سے ایسی حرکت نہ کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ لیکن آپ نے کہا کہ اسلام میں چوری کی سزا یہ ہے کہ چور کے ہاتھ کاٹ دیئے جاتے ہیں لہٰذا میں تیری ہی درانتی سے تیرے ہاتھ قلم کر رہا ہوں اور انہوں نے ہاتھ کاٹ دیئے۔ جب یہ معاملہ پولس کو معلوم ہوا تو پولس نے خاکی شاہ کو قید کر کے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا۔ مجسٹریٹ نے سنوائی کے بعد کہا کہ آپ اچھے خاندان اور ولی ہیں اسی لئے میں آپ کو چند دنوں کی سزا دے رہا ہوں۔ چند دنوں کے لئے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ پولس نے آپ کو لیجا کر حوالات میں بند کر کے قفل لگوا دیا لیکن چند ہی لمحوں کے بعد وہ راستے پر دکھائی دیئے۔ پولس والوں کو بہت تعجب ہوا انہوں نے حوالات کا معائنہ کیا تو قفل صحیح و سالم ہے لیکن قیدی باہر ہے۔ آپ کے ان کرامات کو دیکھکر پولس کو بہت تعجب ہوا جب سے آپ کی بہت عزت کی اور معافی کے خواستگار ہوئے کہ ہم نے آپ کو قید کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے ہم کو بھی آپ کی اولاد میں سے سمجھیں اور ہمیں معاف کر دیں۔ ابھی وہ قید کی مدت ختم نہیں کر پائے تھے کہ اسٹیشن کے معائنے کے لئے سپرنٹنڈنٹ آنے والے تھے۔ پولس والوں نے آپ کے پاس آکر درخواست کی کہ آپ اندر حوالات میں آجائیں تاکہ ہماری نوکریاں سلامت رہیں۔ پولس والوں کی درخواست پر آپ نے چلّہ کا ارادہ کیا انہوں نے پولس کو ہدایت کر دی کہ چالیس دن تک نہ کوئی مجھے بات کریں اور نہ کھانے پینے کے لیے آمادہ کریں۔ آج سے ٹھیک چالیس دن کے بعد میرے چند آدمی مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں آئیں گے تو انہیں چابی دیدو اور ان سے کہو کہ بسم اللہ کہہ کر کھولیں۔ وہ میرے کھانے پینے کا انتظام کریں گے اور وہ اپنے چلّہ میں مشغول ہو گئے۔ پولس والوں کو اس بات کا تعجب تھا کہ یہ آدمی کھانے پینے کے بغیر زندہ کیسے ہے۔ تو وہ روزانہ حوالات کے نزدیک جاتے اور کان لگا کر سنتے تو ان کو وظیفہ کی آواز اللہُ، اللہُ، سنائی دیتی تو سمجھتے کہ یہ آدمی زندہ ہے اور خاموش ہو جاتے حضرت کے بتائے ہوئے لوگ یعنی چند افراد جو ان کے مرید بن تھے چالیس دن کے بعد اپنے مرشد کو ڈھونڈتے ہوئے اسٹیشن کے پاس آئے تو حضرت نے جو حلیہ اور نشانی بتائی تھی وہ ان

افراد میں دیکھکر ان کے مریدین کو حوالات کے پاس لے گئے اور چابی دی۔ مریدوں نے اللہ کا نام لیکر قفل کھولا اور آپ حوالات سے باہر آئے اور آپ کو رہا کر دیا گیا۔ اس طرح انہوں نے اپنا چلّہ بھی پورا کیا اور پولس والوں کی ملازمت بھی بحال کر دی۔ پھر ان کے مریدوں کی فرمائش پر وہ میسور چلے گئے۔

میسور کا ایک دلچسپ واقعہ خاکی شاہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ اپنے مریدین کی فرمائش پر میسور پہنچے تو ان کا کام یہ تھا کہ رات بھر اوراد و ظائف میں مشغول ہوتے اور دن میں جہاں ان کا من چاہتا پھرتے رہتے اور جہاں کہیں نیند آتی سو جاتے میسور میں کرشنا راج وڈیر کا دور تھا۔ ایک دن وہ چامنڈی کے پوجا کی تیاری کر رہا تھا۔ راجا کے نوکر چاکر محل اور اس کے اطراف کا علاقہ اور راستے وغیرہ صاف کر رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ خاکی شاہ محل کے قلعہ کی دیوار سے لگے گھاس پر محو خواب ہیں۔ وہ عموماً خاکی لباس پہنا کرتے تھے اسی لئے ان کا نام بھی خاکی شاہ پڑ گیا تھا۔ نوکروں نے ان کی اس ظاہری حالت کو دیکھا سمجھا کہ کوئی راہ گیر تھک ہار کر سو گیا ہے۔ جیسا کہ نوکروں کا طریقہ ہے انہوں نے گھڑکی کے ساتھ آپ کو جگایا اور برا بھلا کہنے کے بعد وہاں سے نکال دیا تو آپ نے پوچھا کہ میں کہاں جاکر سو رہوں نوکروں نے جواب دیا کہ یہاں آرام کرنے کے لئے تیرے واسطے جگہ نہیں ہے جا چامنڈی کے پہاڑ پر بہت سے منڈپ ہیں وہیں جاکر سو رہ۔ یہ یہاں سے سیدھے چامنڈی پہاڑ پر گئے اور سو گئے۔ شام میں جب چامنڈی کی پوجا پاٹ اور شب گشت کے بعد راجا کی حاضری میں یہ جلوس چامنڈی کے پہاڑ کی طرف واپس جا رہا تھا۔ چامنڈی کا رتھ ٹھیک اسی جگہ پر رک گیا جہاں سے خاکی شاہ کو گھڑکی دیکر نکال دیا گیا تھا۔ سارے لوگ حیران پریشان ہیں لاکھ کوشش کر رہے ہیں کہ رتھ کو آگے بڑھائیں مگر چامنڈی کا رتھ ہے کہ ٹس سے مس نہیں ہو پا رہا ہے۔ راجہ کو بھی تعجب ہوا پریشان ہو کر اس نے سوچا کہ اب کیا کریں رات آدھی سے زیادہ گذر چکی ہے لیکن رتھ لاکھ کوشش کے باوجود اپنی جگہ سے ہل نہیں پا رہا ہے اب کیا کریں۔ راجہ نے اپنے راج پروہتوں سے پوچھا۔ ان برہمنوں نے

زائچہ بنایا اور حساب کتاب کرنے کے بعد کہا کہ یہاں ایک نیک انسان آرام کر رہا تھا اس کی تحقیر ہوئی ہے۔ لہٰذا جب تک وہ معاف نہیں کرے گا یہ سواری آگے نہیں بڑھ پائے گی۔ راجہ نے نوکروں کو طلب کیا اور پوچھا کہ معاملہ کیا ہے۔ نوکروں نے بتایا کہ دوپہر میں ایک شخص یہاں سو رہا تھا ہم نے اسے یہاں سے نکال دیا اب پتہ نہیں وہ شخص کہاں ہے۔ راجہ نے اسی وقت سارے نوکر چاکر خاکی شاہ کی تلاش میں بھیج دیئے تاکہ اس شخص کی جس کی تحقیر ہوئی ہے اسے واپس بلایا جائے اس کی عزت و احترام کی جائے تاکہ دیوی کا رتھ آگے بڑھ سکے۔ راجہ نے تلاشی کا حکم صادر کیا کہ تلاشی کے بعد مجھے مطلع کیا جائے اور محل میں چلا گیا۔ چانڈی کا رتھ بیچ سڑک میں اسی طرح کھڑا رہا اور لوگ بھی آپ کے منتظر اسی جگہ بیٹھے رہے۔ بہت تلاش و جستجو کے بعد خاکی شاہ چانڈی کے اسی منڈپ میں ملے۔ نوکروں نے انہیں مطلع کیا کہ آپ کو راجا یاد کر رہا ہے بہتر ہے کہ آپ ہمارے ساتھ اسی وقت ساتھ چلیں۔ خاکی شاہ نے ان نوکروں سے کہا کہ میں نے ایسی کوئی غلطی تو نہیں کی کہ راجہ کے دربار میں حاضری دوں اور وہ بھی اس وقت، نوکروں نے کہا کہ ہم یہ نہیں جانتے کہ آپ نے کیا غلطی کی ہے راجہ کا حکم ہے آپ چل رہے ہیں یا اٹھا کر لے جائیں۔ خاکی شاہ نے کہا کہ مجھے ہاتھ مت لگاؤ میں خود آؤں گا۔ جب وہ محل کے دروازے پر پہنچے تو اندر جانے سے جھجک رہے تھے۔ نوکروں نے دروازے کے پیچھے سے آپ کو اندر دھکیل دیا اور راجہ کو اطلاع ملی کہ وہ شخص جس کی تحقیر ہوئی تھی آیا ہے۔ راجہ نے دیکھا کہ ایک حسین و جمیل گورے رنگ کا آدمی ہے لیکن خاکی لباس پہن رکھا ہے۔ آپ سے بہت عزت سے بات کی اور پوچھا کہ آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں آپ کا حال چال کیا ہے۔ خاکی شاہ نے راجہ سے ساری تفصیل بتائی اور نوکروں کا رویہ بھی بیان کیا۔ راجہ نے بہت منت سماجت کی کہ یہ نوکر اور ہیں سب آپ کی اولاد میں سے ہیں بہتر ہے کہ آپ ان کی غلطی کو معاف کر دیں۔ جب تک آپ ان کی غلطی کو معاف نہیں کریں گے چانڈی آگے نہیں بڑھے گی۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کہاں کھڑی ہے آپ کو اس مقام پر لے جایا گیا جہاں رتھ کھڑا

ہوا تھا۔ آپ نے غصّہ سے گھور کر چانڈی کو دیکھا اور ایک گندی گالی دی اور پھر یہ کہا کہ تو نے اتنے لوگوں کو اتنی رات گئے ستایا ہے چل آگے چل۔ آپ کا حکم ہونا ہی تھا کہ چانڈی کا دتھ آگے بڑھ گیا۔ راجہ کو بہت تعجب ہوا۔ آپ سے عاجزی اور انکساری سے درخواست کی کہ وہ محل میں رہ جائیں لیکن آپ نے انکار کیا اور مریدین کے ساتھ ہی رہے راجہ نے آپ کے نام وظیفہ جاری کیا جو تادم زیست جاری رہا۔ آپ کے انتقال کے بعد راجہ نے خود ان کے تجہیز و تکفین کا انتظام کیا اس طرح وہ مسجد خاکی شاہ میں دفن ہوئے۔

فرید اللہ شاہ حسینی بھی صاحب تصانیف تھے۔ ان کی بہت سی کتابیں ادب اور تصوف پر بتائی جاتی ہیں۔ لیکن ان کے ورثاء نے ان کی تصانیف کو باقی نہیں رکھا جیسا کہ عام طور پر قدیم مخطوطات کو ضائع کر دیا گیا اسی طرح ان کی تصانیف بھی ضائع ہو گئیں بتایا جاتا ہے کہ ان کے قدیم مخطوطات جن میں ادبی و تصوف کی کتابیں ایک گودام (کھنیج) میں بھر کر رکھی ہوئی تھی۔ جب دھان کی فصل آئی تو دھان بھرنے کے لئے اسی گودام کو خالی کر دیا گیا۔ اور اس گودام میں جو کتابیں بھری ہوئی تھیں وہ ساری کی ساری کنویں میں ڈال دی گئیں۔ اس طرح ان کے سارے تصانیف ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ضائع ہو گئیں۔ فرید اللہ شاہ حسینی کا شجرہ موجود ہے۔

ان کا مقبرہ بڑا عالی شان وسیع اور کشادہ ہے۔ مقبرہ کی عمارت پچاس فٹ بلند ہوگی مقبرہ کے اندر فرید اللہ شاہ حسینی اور ان کے بھانجے معصوم علی شاہ کی مزاریں ہیں مقبرہ کے اوپر بڑا گنبد ہے اور گنبد پر کلس موجود ہے۔ سارا مقبرہ سنگین اور منقش ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ان کے مریدین میں سے کسی نے نیاز کے طور پر سونے کا کلس آپ کے مزار پر لگایا تھا۔ لیکن یہ چوری ہو گیا۔ اسی لحاظ سے اس مقبرہ کا نام سونے کے کلس کا مکان پڑ گیا۔ اب سونے کی جگہ پیتل کا کلس لگا ہوا ہے۔ ان کے خاندان والے مقبرے کے جنوبی حصّہ میں دفن ہیں۔

ان کے خاندان کے افراد اب بھی موجود ہیں۔

محمود خاں کا روضہ

گز یٹیر نے اس روضہ کی بہت تعریف کی ہے اور اس روضہ کو ترکی طرز تعمیر کا بہترین نمونہ قرار دیا ہے۔ مقبرہ کے اطراف واکناف میں ان کے خاندان والوں کی قبریں ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ محمود خاں اس زمانے میں ایک بہت بڑے جاگیردار تھے۔ اس مقبرہ کے گنبد، نقش و نگار کافی دیدہ زیب ہیں۔ لیکن اب اس مقبرہ کی حالت بہت خستہ ہے۔ مقبرہ کے اندر جو قبریں ہیں وہ بھی گرتی جا رہی ہیں اور گنبد بھی بوسیدہ ہو چکا ہے۔ یہ روضہ ابراہیم روضہ کے دائیں جانب موجود ہے۔

ابراہیم روضہ

یہ روضہ برکی مسجد کے جنوبی حصہ میں ہے اور محمود خاں کے روضہ کے دائیں جانب موجود ہے۔ روضہ کے سامنے ایک کنواں ہے

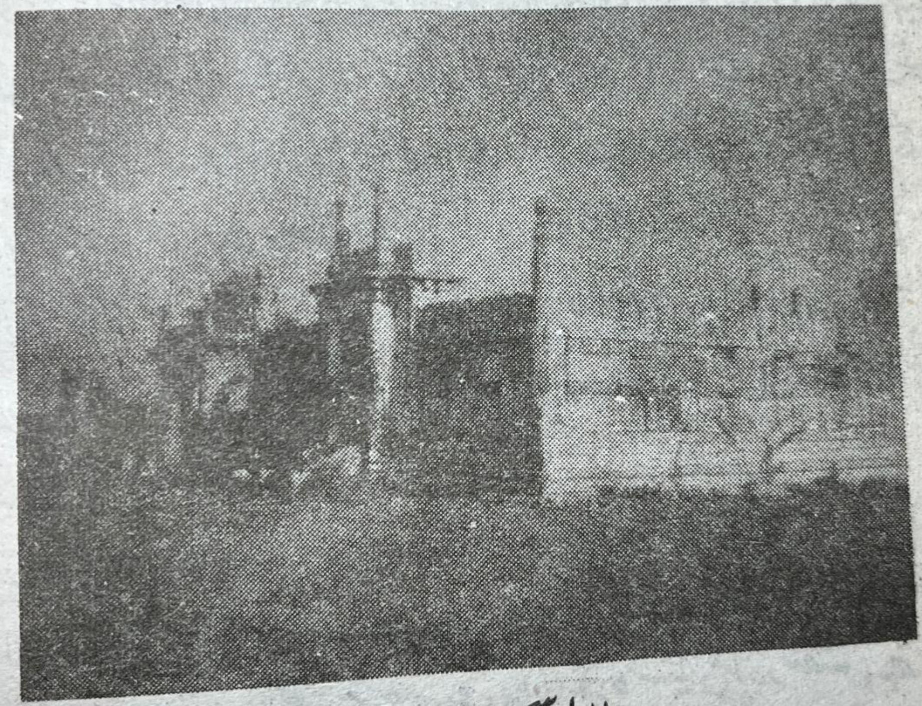

ابراہیم روضہ

جس کو پریوں کی باوڑلی کہتے ہیں۔ اس میں اترنے کے لئے سیڑھیاں ہیں اور پانی نکالنے کا انتظام بھی ہے۔ اس روضہ ابراہیم میں ابراہیم خاں نامی جاگیردار جو محمود خاں کے رشتہ دار ہی بتائے جاتے ہیں مع خاندان آرام فرما ہیں۔ روضہ کے چاروں طرف سنگین دیوار ہے

جس میں نقش و نگار بنے ہیں۔ احاطے کے چاروں کونوں میں چار مینار ہیں۔ روضہ کے اوپر نہ کوئی چھت ہے اور نہ کوئی گنبد۔ اس احاطہ میں قبریں اور مینار ہی دو منفرد چیزیں ہیں سب سے یہ مسلمانوں کی جگہ سمجھی جاسکتی ہے۔ ورنہ اس کی باقی ساری چیزیں جیسے اس کا طرز تعمیر، چوکھٹ سیڑھیاں اور ان کی بناوٹ اس کا نقش و نگار جالی دار کھڑکیاں عمارت کا بالائی حصہ ستون پیاراپٹ وغیرہ وغیرہ ہندو طرز تعمیر کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔

منجو پیر مکان (قبرستان)

یہ قبرستان شہر کے شمالی مغربی حصہ میں واقع ہے منجو پیر نقشبندی سلسلہ کے فقیر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کے بھائی اور آپ دادا حیات کے پہاڑ میں تھے۔ اپنے بھائی کو دادا حیات پہاڑ میں چھوڑ کر آپ اپنی بہن کے ساتھ سرا چلے آئے۔ اپنی بہن کو آصف بہادر شاہ کے ساتھ بیاہا۔ لیکن وہ شادی نہیں ہوئے۔ اسی لئے ان کی بہن کے خاندان والے آصف کے نام سے مشہور ہیں دوسرے روضوں کی طرح آپ کی قبر پر کوئی گنبد نہیں ہے اور نہ ہی روضہ یا مقبرہ ہی بنا ہے آپکی قبر بالکل سیدھی سادھی ہے تقریباً ۱/۲ ۱۰ فٹ لمبی ہوگی۔ بتایا جاتا ہے کہ آپ کا

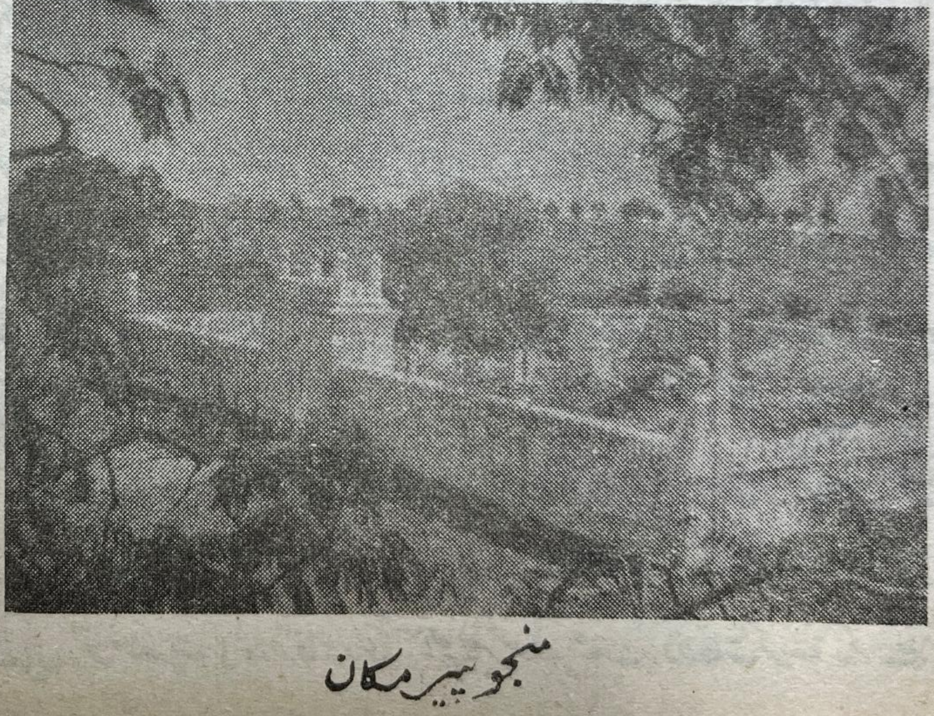

منجو پیر مکان

آپکا جبّہ اب بھی ان کے خاندان والوں کے پاس موجود ہے جس کا قد تقریبًا قد کافی لمبا تھا۔ ۹ رفٹ ہوگا۔ ان کا عمامہ بھی موجود ہے۔ آپ کا اصل نام حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے ۹۹ ناموں میں سے ایک ہے مِنْجیِؒ۔ آپ نے پیری مریدی کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ اسی لئے آپ کو منجی پیر کہا جاتا ہے۔ ہندو مسلمان سبھی آپ کے عقیدتمند تھے اور مرید بھی۔ ہندو اور عام مسلمان آپ کا نام صحیح طور پر ادا نہیں کر سکتے تھے جس کی بگڑی شکل منجو پیر بن گیا ہے اور آج بھی اسی نام سے آپ مشہور ہیں۔

روایت ہے کہ آپ نے اپنی دوران حیات میں ہی اپنی آخری منزل کی تیاری کر رہے تھے۔ اپنے لئے اور اپنے مریدین کے لئے جگہ کا انتخاب کرنے کے بعد اس جگہ کو ایک دیوار کے احاطے سے گھیر رہے تھے جو آج بھی موجود ہے۔ ایسے میں ٹمکور کے پیر حضرت باشاہ قادری جو حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے پڑ پوتے ہیں جن کا مزار ٹمکور میں جال کا مکان کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مکان جنرل ہاسپٹل کے شمالی جانب ہے اور حضرت باشاہ قادری کا مزار قبرستان کے بیچوں بیچ واقع ہے۔ آپ کے مزار پر جو اینٹ اور گارے سے احاطہ کیا ہوا ہے اس پر بہت ہی اعلیٰ اور نفیس کام ہوا ہے۔ ایسا کام قدیم ریاست میسور میں بہت کم پایا جاتا ہے۔ ٹمکور سے آٹھ کیلومیٹر دور جنوب مشرق میں ایک مقام ہے یہاں حضرت باشا قادری کے پوتے مومن باشاہ قادری مقیم ہیں جن کا عرس ۱۲ ر ماہ صفر کو ہوتا ہے۔ آپ بھی صاحب کرامات ولی تھے۔ حضرت باشاہ قادری کی طرح مومن بادشاہ بھی صاحب تصانیف تھے لیکن ان کے تصانیف کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ کیسرمڑو میں ان کی جائیداد ہے۔ اس انعامی زمین میں جو مزار کے اطراف واقع ہے دھان کے کھیت بوئے جاتے ہیں اس کی کرامت یہ ہے کہ دھان کی بالیاں جو آتے ہیں ان میں جڑواں دھان پیدا ہوتا ہے آج بھی یہ دھان ایسا ہی اُگتا ہے۔ ان کے خاندان والوں میں قادر ولی زندہ ہیں اور ان کے کرامات سے ٹمکور والے بہت فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تو حضرت باشاہ قادریؒ منجو پیر حضرت سے ملاقات کرنے کے لئے شہر

پر سوار ہو کر سرا تشریف لائے. لوگوں کا ہجوم آپ کے پیچھے لگا ہوا تھا اور لوگ آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے کہ آپ کتنے بڑے ولی ہیں جو شیر کو اپنے قابو میں کر رکھا ہے. لیکن ہمارے منجو پیر بے شک بہت بڑے ولی ہیں لیکن انہوں نے آج تک کوئی کرامت نہیں دکھائی۔ کیسے ولی ہیں. یہ سرگوشی حضرت منجو پیر کے کانوں میں پڑی تو مہمان کے ساتھ علیک سلیک و بات چیت و مہمانی کے بعد جب وہ واپس لوٹے تو آپ کے دوست بادشاہ قادری شیر پر سوار ہوئے منجو پیر بھی اپنی کچی دیوار پر سوار ہوئے اور کہا کہ اے دیوار چل۔ ایک پیر شیر پر سوار ہیں اور دوسرے دیوار پر دونوں ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ لوگوں نے جب یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تو عقیدت سے نظریں جھک گئیں اور سرگوشیاں ختم ہو گئیں پھر آپ نے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ زندہ درندوں کو قابو کر لینا کوئی بڑی کرامت نہیں ہے البتہ غیر جاندار چیزوں کو قابو میں کر کے ان سے کام لینا بہت بڑی بات ہے. یہ واقعہ مجھے مرحوم رحمت اللہ خاں صاحب آصف وظیفہ یاب ڈپٹی کمشنر نے بتایا تھا.

ایک اور کرامت آپکی مشہور ہے کہ عام طور پر آپ جمعرات یا جمعہ کے دن حجامت لیا کرتے تھے. حجام ان کے گھر آیا کرتا تھا. ایک مرتبہ غیر معمولی طور پر وہ حجام عام دنوں کو چھوڑ کر دوسرے دن گیا تو آپ نے کہا کہ تم بہت دیر کر کے آئے ایسے اوقات ٹھیک نہیں ہوا کرتے پھر بھی حجام نے بڑی معذرت کی اور آپ کا خط بنانے لگا. اچانک کیا دیکھتا ہے کہ آپ نے ہاتھ بڑھایا اور اس ہاتھ میں سے پانی جاری ہو گیا. اس منظر کو دیکھ کر حجام حیران رہ گیا پھر پوچھا کہ واقعہ کیا ہے. حضرت نے بہت سمجھایا کہ یہ باتیں تو سمجھ نہیں سکتا تو مجھ کو مجبور نہ کر ورنہ آئندہ مجھ سے تجھ کو بہت تکلیف ہوگی. پھر بھی حجام نے بہت تقاضا کیا تو آپ نے کہا کہ اس واقعہ کو کسی کے سامنے بیان نہ کر. واقعہ یہ ہے کہ میرا مرید دریا میں ڈوب رہا تھا جو کوسوں میل دور ہے. اس نے میرے نام کی دہائی دی اور میں نے اس پر جو زائد پانی آ گیا تھا اپنے ہاتھ سے نکال لیا۔ حجام اس واقعہ کو دیکھ کر بہت حیران ہوا. وہ پیر کی بات کو دھیان میں نہ رکھا اور

اس واقعہ کو کسی کے سامنے بیان کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پاگل ہوگیا۔

کہا جاتا ہے کہ آپ بھی صاحب تصانیف تھے لیکن ان کی بہت سی تصانیف ضائع ہوچکی ہیں ان کے خاندان میں ایک شخص تھا جو کیمیا کا دیوانہ تھا۔ ان کی کتابوں میں علم کیمیا کی کتابیں بھی تھیں وہ ان کتابوں کا مطالعہ کرتا اور جڑی بوٹیوں کی تلاش میں جنگل جنگل بھٹکتا رہتا۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریزوں کے دور حکومت میں یہ بات بھی مشہور ہوگئی کہ پرانے جاگیردار اور انعامی زمینات رکھنے والوں کی جائدادیں ضبط کرلی جائیں گی ساتھ ساتھ ان کو سزا بھی ہوگی اس لئے کہ یہ سلطنت خداداد کے نمک خوار تھے۔ ان ساری چیزوں کو مدّنظر رکھتے ہوئے ایک بڑی بڑھیا نے منجو پیر کے تصانیف اور جائیداد سے متعلق ریکارڈ اور تلواریں وغیرہ کنوئیں میں پھینک دیئے جس کی وجہ سے ان کی بہت سی چیزیں ضائع ہوگئیں۔

ان خاندان والوں کا کہنا ہے کہ منجو پیر حضرت کو ۴۰ قریہ جاگیر میں دیئے گئے تھے جو بعد میں کم کرکے ۷ قریہ ہوئے پھر چند ایکڑ زمین رہ گئی ہے۔ منجو پیر حضرت کا شجرہ بھی موجود ہے۔ اوران کا رسالہ ہے جو تصوف سے متعلق ہے

جیسا کہ پہلے ہی بتایا جاچکا ہے کہ منجو پیر شاہ کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ شاہ محمد شاہ دو جگنٹے والے حضرت بھی آپ کے رشتہ دار تھے۔ آصف بہادر خاں جو بیجاپوری دور کے آخری گورنر تھے ان ہی کے خاندان والوں میں سے ایک فرد کی شادی منجو پیر کے بہن سے ہوئی تھی۔ ان ہی کی اولاد آج بھی باقی ہے۔ ان کے ایک بھائی تھے جن کا نام اعظم خاں تھا۔ یہ بھی پٹھان تھے۔ بیجاپور کے زوال کے بعد اعظم خاں سرا سے ہجرت کرکے شیموگہ کی طرف چلے گئے اور ایک جگہ قیام کیا اور ایک بستی بسائی جس کا نام اعظم پور رکھا اسی کی بگڑی شکل اجّم پور ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ سرا کے موچی واڑہ ایک محلہ ہے وہیں آصف بہادر خاں کا محل تھا۔ رحمت اللہ خاں صاحب آصف وظیفہ یاب ڈپٹی کمشنر مرحوم اسی خاندان سے تھے۔ آصف بہادر خاں اور ان کے خاندان والوں کا قبرستان ملک ریحان کے مقبرے کے مشرقی حصہ میں

واقع ہے۔ رحمت اللہ خاں صاحب نے اپنی کوششوں سے اسی مزار میں ایک یتیم خانہ شروع کیا۔ ایک پرائمری سکول اور عربی مدرسہ بھی شروع کیا ہے۔ اس طرح یتیم خانہ کے بچوں کی کے لئے دینی و دنیاوی تعلیم کا بندوبست کیا ہے۔ آپ کے انتقال کے بعد یہ یتیم خانہ الامین سوسائٹی کے تحویل میں دیدیا گیا ہے۔

عارف شاہ قادری

عارف شاہ قادری کا مقبرہ قلعہ سے قریب واقع ہے۔ آپ کا مقبرہ سیدھا سادا ہے اور اس پر گنبد بھی بنا ہے مقبرہ کے مغربی جانب ایک ہشت پہلو خوشنما گنبد بنا ہے بڑا نفیس کام اس گنبد پر ہوا ہے اس کو مہندی کہتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ عارف شاہ قادری کے چلہ کشی کا مقام تھا۔ مہندی

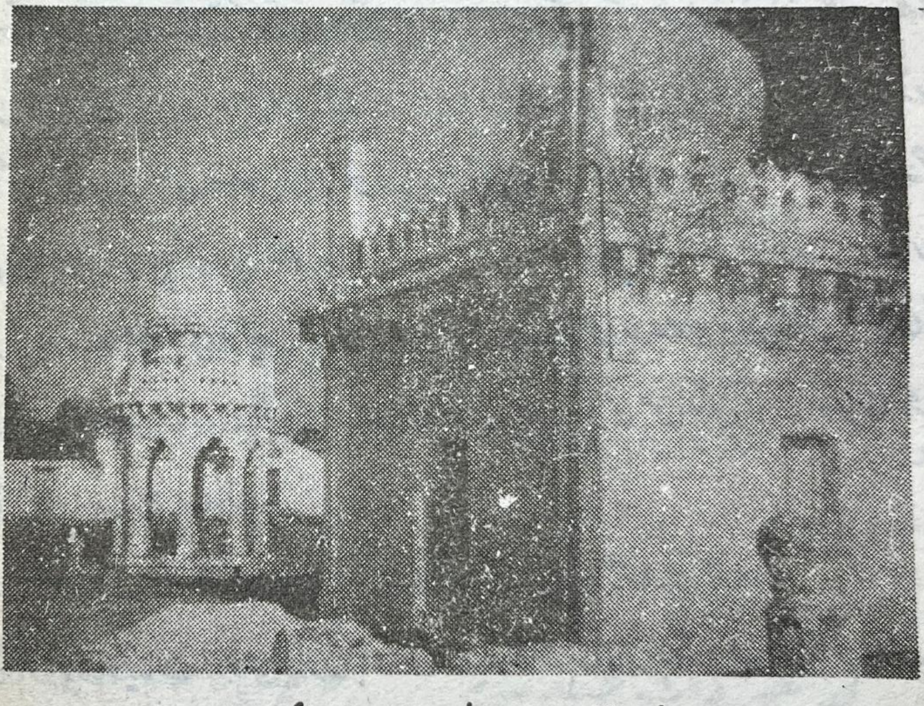

عارف شاہ قادری روضہ مہندی

کے اوپر جو گنبد بنا ہوا ہے وہ اینٹ اور گارے کا ہے۔ اس پر جو آرٹ ہوا ہے وہ اناناس کے اوپری حصّہ کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ مقبرہ کا صرف ایک دروازہ ہے جو جنوب کی طرف ہے آپ کا شجرہ بھی تھا جو عرس کے موقع پر پڑھا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ شجرہ بوسیدہ ہونے پر

ایک صاحب نے اس کی فوٹو کاپی بنانے کے لئے بنگلور لارہے تھے جبکہ سراشہر میں اس کی سہولت نہ تھی کہ راستے ہی میں بس حادثہ کا شکار ہوگئے اور یہ شجرہ کسی نے اٹھا لیا۔ اس طرح عارف شاہ قادری کا جو اصل شجرہ سرامیں تھا تلف ہوگیا۔ البتہ عارف شاہ قادری نے اپنے مریدوں کو جو شجرہ دیئے تھے ان کے کچھ حصے ملے ہیں ان کی نقلیں میرے پاس موجود ہیں۔

عارف شاہ قادری کے بزرگ بیجاپور سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد کا نام سید محمد اور دادا کا نام سید حافظ تھا۔ سید حافظ سید بدر الدین کے فرزند تھے۔ عارف کے مرشد شاہ صدر الدین نلمنگل والے تھے۔ نلمنگل ٹمکور بنگلور شاہراہ پر بنگلور سے ۲۵ کیلو میٹر دور واقع ہے۔ آپ بھی صاحب تصنیف صوفی گذرے ہیں۔ ان کی وفات تقریباً ۱۱۷۵ھ ہے۔ آپ کا مزار نلمنگل کے بس اسٹانڈ کے پچھلے حصے میں واقع ہے آپ کے مزار پر کوئی گنبد نہیں ہے۔ مزار کے اطراف دیوار کے ذریعہ احاطہ کر دیا گیا ہے۔ اس دیوار میں نقش و نگار ہیں کافی جاذب نظر ہے۔ آپ کی بہت سی مثنویاں تصوف پر ملتی ہیں جن کے نام یہ ہیں (۱) کسب عروج (۲) رموز الکاسبین (۳) محویت نظم شاہ صدر الدین وغیرہ (۴) نظم تصوف (۵) رسالہ تصوف (۶) رسالہ موحسی (کیمیاگری) (۷) ترجمہ رسالہ خواجہ بندہ نواز (۸) مثنوی من درپن (۹) مراۃ الاذکار (۱۰) مثنوی مصباح النور (۱۱) مثنوی من لگن (۱۲) مثنوی روح النصائح (۱۳) السابع صفات۔

ان مثنویوں کے مخطوطات ذیل کے کتب خانوں میں ملتے ہیں

(۱) ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد (۲) کتب خانۂ سالار جنگ حیدرآباد (۳) کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد (۴) او آر آئی میسور۔

اپنے مرشد سے عارف شاہ قادری کو بہت زیادہ عقیدت و ارادت تھی اپنے مرشد کی طرح آپ بھی صاحب تصانیف تھے۔ ان کی مثنویاں حسب ذیل ہیں۔

(۱) حقوق المسلمین ۱۲۲۳ھ (۲) مطلوب المریدین ۱۲۳۳ھ (۳) عقائد نامہ ہندی

۱۲۴۰ھ (۴) وفات نامہ (۵) مثنوی تولد نامہ (۶) در سینی (۷) مسدس در مدح پیران پیر (۸) دلیل الصابرین (۹) کشف الربوا۔

مثنوی حقوق المسلمین

عارف نے یہ مثنوی اپنے دوست غلام علی اور دیگر اصحاب کے اصرار سے لکھی ہے۔ اس مثنوی میں کل دس باب ہیں مثنوی میں کل پانچ ہزار سات سو چار اشعار ہیں۔

اس مثنوی کا دیباچہ نثر میں ہے۔ یہ مثنوی آپ کی شاہکار مثنوی ہے مسلمانوں کے حقوق و فرائض کا تفصیلی بیان ہے۔ جا بجا قرآنی آیات، احادیث شریفہ، اقوال بزرگان، روایات و حکایات وغیرہ سے کام لیا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔ نمو

فیض سے اوس کے تونگر ہو رفقیر نعمت دارین سے تھے بہرہ گیر
رحمت رضواں ہو اوس کی روح پر پر کرے حق نور سے اس کی قبر
کاتباں ہو رتم خدا کے واسطے اور روح مصطفےٰ کے واسطے
اس سے ایک بیت مت چھوڑو تمے رشتہ و مضمون کو مت توڑو تمے

مثنوی مطلوب المریدین

عارف نے یہ مثنوی اپنے دینی دوستوں سید حسن اور سید محی الدین کی فرمائش پر لکھی تھی۔ اس مثنوی میں کل دو ہزار دو سو ستائیس ابیات ہیں۔ اس مثنوی میں پیر و مرشد سے ارادت کے آداب پر روشنی ڈالی ہے اس میں کل چھ ابواب ہیں۔ مثنوی کے آغاز میں نعت شریف بڑی عقیدت سے رکھی گئی ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے

محمد مظہر ذات خدا ہے خدا نیں پن خدا سے نیں جدا ہے
محمد شاہ فیل انبیاء ہے محمد تاج فرق اصفیا ہے
ہے اوس کا مرتبہ تعریف ستی بھار نکو صلوت بن کچھ بول زنہار
بھی اوس کے آل اور اصحاب پر سب درود اں ہو و اسلاماں بھیج تواب

علی خاں کی قبریں ہیں۔

ابن میاں ووج گنٹہ

ان کا اصل نام شاہ محمد شاہ تھا۔ ان کا مزار ووج گنٹہ میں ہے۔ جن کا تذکرہ فرید اللہ شاہ حسینی کے باب میں کیا جا چکا ہے۔ آخری عمر میں انہوں نے اپنا ٹھکانا ایک مندر میں کیا تھا وہیں وظائف اوراد وغیرہ میں مشغول رہتے تھے۔ انتقال کے بعد وہیں دفن کیا گیا پھر ہندوؤں نے اس مندر سے بت اٹھا کر نئے مندر میں رکھ لیا۔ یہ مندر ان کا مقبرہ ہے۔

شاہ یٰسین قادری

یہ بھی قادریہ سلسلے کے ایک فقیر ہیں۔ ان کا مزار کہاں ہے معلوم نہ ہو سکا۔ ان کا شجرہ ہے جو ۲۹ رجب المرجب ۱۲۹۸ھ میں لکھا گیا ہے۔

شاہ علی عباس

یہ بھی سرا کے صوفیوں میں سے ایک تھے۔ ان کا مزار الامین گرلس ہائی سکول کے وسط میں واقع ہے۔ سالانہ عرس بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ ان کے نام پر عربی مدرسہ بھی چلایا جا رہا ہے اور ایک محلہ شاہ علی نگر کے نام سے بھی موسوم ہے۔ بہت سے لوگوں نے ان کو دیکھا ہے۔ ان کے کرامات یہ بیان کئے جاتے ہیں کہ رات کے وقت حق کا وظیفہ جاری رہتا خانقاہ میں رہتے۔ دن میں گھر گھر جاتے اور کھانا مانگتے۔ جب کسی گھر کے سامنے جا کر کھانا پوچھتے اور جواب نفی میں ملتا تو اپنے زبان پر جو کھانے کا نام آتا لیتے اور گھر والوں سے کہتے کہ تمہارے گھر میں یہ کھانا یہ سالن موجود ہے۔ اگر گھر میں نہ بھی ہوتا وہ چیز خود بہ خود گھر میں ظاہر ہو جاتی۔ مثال کے طور پر وہ یہ کہتے کہ مجھے کیوں نفی میں جواب دیتے ہو جا کر تو دیکھو کہ تمہارے چولھے پر لوبوں کی کڑھی پک رہی ہے۔ مگر گھر والے جا کر دیکھتے تھے تو واقعی وہاں لوبے کی کڑھی پکی ہوئی ملتی۔ اس کو لیکر آنے تک وہ وہاں سے غیب ہو جاتے۔

ان کا معمول تھا کہ روزانہ صبح کے وقت ایک سیندھی کے دکان میں جاتے۔ سیندھی

حمد ہے اوس ذات کی جو ہے قدیم و بقا — نور جلال و جمال غیب ظاہر کیا
جب تھا اپے بے خبر اپنے سے اور غیر سے — نیں تھا ظہور صفات کچھ نہ تھا اوس کے سوا
فرش کیا اک بسیط اوس کے لئے سیر گاہ — حکم کیا سجدہ کر رب کے تیں اپنے سدا
امر سے کن کے ہوئے حور و ملک جن و انس — لوح و قلم کرسی و عرش سب ارض و سما

درسینی محمود حسین صاحب نے اس کو شائع کیا ہے. لکھتے ہیں کہ "یہ امر قابل غور ہے کہ ایسے عام دین دار صوفی شاعر کے قلم سے ایک نظم ایسی بھی نکلی ہے جس کی اس سے توقع نہیں ہو سکتی. یہ دراصل بیجاپوری کا رنگ ہے جو اس نظم میں ظاہر ہے یوں دیکھا جائے تو آپ کی صوفیانہ اور دینی شاعری اور آپکے پیر و مرشد کی نثر و نظم کا تعلق بھی بیجاپوری مکتب ہی سے ہے. بلکہ قدیم ریاست میسور کی دکھنی ادب کو اسی مکتب کی ایک شاخ سمجھنا چاہیئے درسینی میں ایک فراق کی ماری عورت اپنے جذبات اور دلی کیفیات کی ترجمانی کی ہے. نمونۂ کلام یہ ہے۔

نیں دستا کاں ہے لال مرا — نا بولوں اوس سے حال مرا

کئی دن سوں پیتم آیا نیں — جس دن سے اوستور ہوا
منجہ سر پہ سایہ سجایا نیں — ہو ربر سے میرے دور ہوا
کچھ بات میٹھی سنوایا نیں — اس غم سے سینہ پور ہوا
منجہ بچھڑی کو منوایا نیں — پھٹ دل کا شیشہ چور ہوا
دل میرے کو بتلایا نیں — یہ تن من جل تندور ہوا
نیں دستا......... — نیں دستا........

آخری حصہ یہ ہے

میں باندی کا ہور سجن — ہوں عارف پن عرفان نہیں

پیو میرے تیں مت چھوڑ سجن — ہوں عاشق بِن اوسان نہیں
دل میرے کو مت توڑ سجن — جوں تن ہے اوس میں جان نہیں
اس شیشے کو پھوڑ سجن — جیوں سوتا ہے سدیان نہیں
پھر پھوٹے کے نیں جوڑ سجن — یہ مشکل ہے آسان نہیں
نیں دستا .... — نیں دستا ....

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ عارف کے والد نے جو خود بھی عالم و فاضل تھے۔ نلمنگل میں آپ کو لڑکپن ہی میں حضرت شاہ صدر الدین کے حوالے کر دیا آپ نے ان کی تعلیم و تربیت فرمائی اور انہیں کے زیر سایہ آپ پروان چڑھے عمر بھر ان کے ساتھ رہے۔ نلمنگل میں شاہ صدر کا جو مزار ہے اسی احاطہ میں درگاہ شریف کے سجادہ نشین سید محی الدین قادری بھی مقیم ہیں۔ جو عارف کے پڑپوتے کے فرزند ہیں انہوں نے بتایا کہ عارف ایک سو پینتیس کتابوں اور رسالوں کے مصنف تھے ان کی فہرست اور ان کے مخطوطہ نسخے ان کے پاس موجود تھے لوگ عاریتاً لے گئے اور فہرست تک نہ لوٹائی۔ ایک نظم جو ان کو یاد تھی اس کے اشعار محمود حسین صاحب نے نقل کر لی تھی جس کے اشعار کے نمونے حسب ذیل ہیں۔

کر گئی ہوں کو یاد رویا کر — آنکھو کو آنسوؤں سے دھویا کر
جانور ذکر حق میں مشغول — صبح کے وقت تو نہ سویا کر
خشک مغزی کو تیری غفلت کی — روغن یاد حق بھر دیا کر
عارفا اس کی کذب و غیبت میں — تو زبان کو نہ اپنی گویا کر[1]

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم صاحبہ نے ریاست میسور میں اردو مثنوی کے ارتقاء میں عارف شاہ قادری کے بارے لکھتی ہیں کہ "عارف ایک سیدھا سادھا متقی پرہیزگار شاعر ہے جس کو دنیا کے دھندوں اور رنگینیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ عارف شاہ قادری کے

[1] مقالات محمود از میر محمود حسین ص۱۰۱

پھر خاندانی حالات کا سراغ لگا کر ڈاکٹر آمنہ خاتون نے شائع کروایا ہے مگر کئی امور ابھی تحقیق طلب ہیں۔ عارف کا سبھی کلام غیر شائع شدہ ہے صرف درسینی کو میر محمود حسین نے رسالہ سب رس میں شائع کروایا ہے" پھر مقالات محمود میں بڑی تفصیل سے اسی درسنی کو عارف شاہ قادری اور ان کی درسنی کے عنوان سے شائع کیا ہے

موسیٰ جنگلی درویش

ان کا مزار تعلق آفس کے دائیں جانب موجود ہے۔ ان کا شجرہ بھی ہے جن میں ان کا اصل نام سید شاہ محمد ابو صالح موسیٰ الجنگی دوست بتایا گیا ہے۔ سید شاہ محمد عبدالرزاق قادری ان کے مرید تھے جن کا مزار نلمنگل میں ہے۔ ان کے مزار پر سیاہی مائل نیلے پتھر کا تعویذ ہے اور اس پر چادر پڑی ہے ممکن ہے یہاں کوئی عمارت بنی ہو۔ قبر کے چار کونوں میں چار سنگین منقش ستون ہیں۔

اس مکان کو ایک انعامتی زمین بھی دی گئی ہے۔ اس انعام کے لئے شرط یہ رکھی گئی ہے کہ جو مسافرین اس درگاہ کو آئیں ان کے کھانے پینے کا انتظام ہو۔ زمین تری ہے جس کا رقبہ ایک ایکڑ ۲۸ گنٹے ہے پرانی دستاویز سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے

کمال خاں

تعلق آفس کے بائیں بازو میں ان کا مکان ہے قبر کے سرہانے ایک پرانا نیم کا درخت ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ جمالی فقیر ہیں تفصیلات کا علم نہ ہو سکا۔

شاہ ابوالحسن قادری

ان کا مزار N.H. 4 کے بائیں بازو پر شہر کے وسط میں واقع ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ عارف شاہ قادری کے ہم عصر تھے اور شاہ صدرالدین کے مریدین میں سے تھے۔ تفصیلات کا علم نہ ہو سکا۔

نواب درگا قلی خان

یہ سرا کے نواب تھے ان کی قبر ہاسپٹل کے بازو کے قبرستان میں مسجد کی ایک دیوار ہے۔ دیوار کے سامنے ایک چبوترہ ہے اس چبوترے پر ان کی قبر ہے۔ ان کے پہلو میں ان کے فرزند میر اسداللہ خاں اور میر صادق

عقائد نامۂ ہندی یہ ایک مختصر سی ۱۸۵ اشعار کی مثنوی ہے جو سنت جماعت کے عقائد پر لکھی گئی ہے۔ اس میں کل بیس عنوانات ہیں جو روزانہ زندگی کے لحاظ سے کافی مفید کلام ہے۔ نمونۂ کلام

خدا کا حمد اور نعت پیمبر — مناقب چار اصحاباں اطہر
زیادہ تر ہے انداز بیاں سوں — ادا کیوں ہو سکے میری زباں سوں
عقاید فرض ہیں سب مسلمیں پر — زن و مرد گروہ اہل دیں پر
ولیکن خاص لوگاں پر بہر طور ہیں — عواماں کبھوت اس سوں بے خبر ہیں

یہ رسالہ ۱۲۴۰ء میں لکھا ہے اور نلونگل میں اپنے دوست سید اسمعیل کے گھر میں لکھا ہے

مثنوی وفات نامہ یہ ان کی ایک اور مختصر سی مثنوی ہے جو حضورؐ کی وفات کے بارے میں ہے اس میں کل ۲۸۶ اشعار ہیں ابتداء حمد ونعت سے کی ہے۔ نمونۂ کلام

واجب الحمد ہے وجود خدا — کل شئی فانی اس کی ذات بقا
حی القیوم اول و آخر — واحد الباقی باطن وظاہر

حمد و نعت کے بعد حضرت نبی صلعم کے واقعات وصال حقیقی و نیم حقیقی روپ میں پیش کیا ہے۔ اور ان اشعار پر مثنوی ختم ہوگئی ہے

کر زیارت نبی کی ہم کو نصیب — اور شفاعت سے کر سب کو قریب
عارف کمترین با صدق و ادب — ختم کرتوں وفات نامہ اب

مثنوی تولد نامہ یا مولود النبی یا میلاد نامہ یہ چھوٹی سی مثنوی ہے جس میں میلاد شریف کا بیان کیا گیا ہے نمونۂ کلام یہ ہے۔

...الا ان کے آنے پر خوش ہوتا۔ یہ دوکان میں گھس کر پیپوں میں بھری سیندھی اٹھاتے اور اس سے حمام کر لیتے۔ باہر آتے تو موگرے کے پھولوں کی خوشبو مہکتی رہتی۔ بچے ان کے پیچھے یہ نعرے لگاتے ہوئے جاتے کہ شاہ علی عباس پھولوں کی باس۔ ان کے اور بھی بہت سے کرامات بیان کئے جاتے ہیں لیکن طوالت کے خوف سے یہیں ختم کرتے ہیں۔

زندہ شاہ مدار

ان کا مکان (مزار) مارکٹ محلہ میں واقع ہے۔ پہلے یہ مزار ایک درخت کے نیچے تھا۔ اب کسی نے نیاز کر کے احاطہ بنا دیا ہے ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب کبھی قبر کے اطراف گندگی ہو جاتی ہے تو رات کے وقت قریبی گھروں کی کنڈیاں ہلتی ہیں دستک دینے کے آوازیں سنائیں دیتی ہیں لوگ اشارہ سمجھ جاتے ہیں اور قبر کے اطراف کی گندگی صاف کر دیتے ہیں ان کی تفصیلات کا علم تو نہ ہو سکا البتہ انکی ایک تصویر ملی ہے

شاہ شریف کا مکان

یہ مکان موچی محلہ میں واقع ہے۔ پرانی درگاہ ہے۔ ایک وسیع احاطہ کے درمیانی حصّہ میں ان کا مزار موجود ہے اس درگاہ کی انعامی زمین بھی ہے جو تقریباً ۵ ایکڑ ۲۴ گنٹے ہے تفصیلات کا علم نہ ہو سکا۔

قبر آثار محلہ سرا

آثار محلہ میں ایک پرانا مزار ہے جس پر ایک کتبہ لگا ہوا ہے۔ کتبہ کی عبارت یہ ہے۔ یہ مزار خواجہ حسن کا ہے جن کی وفات ۱۴ / محرم ۱۱۰۶ھ میں ہوئی ہے جو ۱۶۹۴ء کے مطابق ہے۔ تفصیلات کا علم نہ ہو سکا۔

بنا مرقد مرحمت و مغفرت پناہ
رضواں بجا بجاہ خواجہ حسن
ولد خواجہ جمال فال چیز من
توابع الدرض فی تاریخ چہار
دہم محرم الحرام ۱۱۰۶ھ

شہر سرا میں جن خاندانوں نے حکومت کی تھی ان خاندانوں کے افراد یہاں اب بھی باقی ہیں۔ بیجاپوری یا عادل شاہی دور کا خاندان، خاندان آصفیہ، بسالت جنگ کے زمانے والے جنگی خاندان یہ دو خاندان یہاں مشہور ہیں۔ ان خاندانوں کے ساتھ ساتھ زنگی، برکی اور سدی خاندان والے بھی ہیں

سرا کے تعلیمی ادارے

	شیشو وہار (نرسری)	اردو	۲
۲-	شیشو وہار (نرسری)	کنڑا	۵
۳-	لوئر پرائمری اسکول	اردو	۵
۴-	لوئر پرائمری اسکول	کنڑا	۸
۵-	ہائر پرائمری اسکول	اردو	۲
۶-	ہائر پرائمری اسکول	کنڑا	۱
۷-	کانونٹ نرسری تا ہائی اسکول	انگریزی	۱
۸-	گورنمنٹ ہائی اسکول		۲
۹-	پرائیوٹ ہائی اسکول		۳
۱۰-	جونیر کالج (پرائیویٹ)		۲
۱۱-	فرسٹ گریڈ کالج (گورنمنٹ)		۱
۱۲-	انڈسٹریل ٹریننگ انسٹیٹوٹ (پرائیوٹ)		۱
۱۳-	انسٹیٹوٹ آف کامرس (پرائیوٹ)		۱
۱۴-	پبلک لائبریری (گورنمنٹ)		۱
۱۵-	عربی مدارس		۷

دیگر ادارے

انجمن	۱	مٹھ	۵
عاشور خانہ	۲	چھتر	۲
مسلم ہاسٹل (سائٹ)	۱	تعلیم خانہ	۱
یتیم خانہ	۲	حمام خانہ	۱
		عیدگاہ	۳
منادر ۳۸ ۔ اس میں اہم منادر ۵ یا ۶ ہیں باقی چھوٹے ہیں۔		قلعہ	۱
		چرچ	۱
مساجد	۱۰		

جاترے

۱- بنڈی رنگناتھ سوامی جاترا تاوریکیرے ماہ جنوری و فروری دس۱۰ دن

۲- شری گنگا بر ہیشور اجاترا پٹنا یکنہلی بماہ جنوری و فروری ۱۵ ار دن

۳- نرسمہا سوامی کا تیرسی بی اواخر فروری ۱۵ ار دن

۴- لکشمی نرائن مندر کا تیر سرا ماگوڈ جاترا اواخر فروری ۲ ار دن

۵- رنگناتھ سوامی کا جاترا ہلی بماہ فروری ۱۵ ار دن

۶- رڈی گنڈا جاترا۔ یہ ہونیہلی سے تین میل دور ہے اگادی کے بعد

۷- منما (تپود کونا) جاترا اگادی کے بعد

اعراس

ملک ریحان کی درگاہ کا عرس — بماہ رجب ۲۲ تاریخ

اللہ درویشو، قادری، موسیٰ جنگلی درویش کمال شاہ قادری

ان تینوں مکانوں کا عرس — رجب کے ۲۲، ۲۳ تاریخ کو ہوتا ہے

شاہ علی عباس کے مکان کا عرس — بماہ ۲۷ ربیع الاول

ابوالحسن شاہ قادری کے مکان کا عرس — ۱۲ ربیع الثانی

منجو پیر مکان کا عرس — ۱۴ شوال

سونے کے کلس کے مکان کا عرس — ۲۶ رجب

کاریگری، دستکاری

۱۔ بیڑی کے کارخانے لائسنس شدہ تقریباً 125

۲۔ چھوٹی دستکاری قینچی کے کارخانے اندازاً ۱۰

۳۔ ماچس کے کارخانے ۲

۴۔ لیتھ ورکس اندازاً ۵

۵۔ گیارتبج اندازاً ۱۰

۶۔ رسی گانٹھنے کے کوئی کارخانے نہیں ہیں گھروں میں تیار کی جاتی ہیں

۷۔ کمبل :- سراتعلق میں بکروں سے اون حاصل کر کے کمبل تیار کئے جاتے ہیں

یہاں سے زیادہ تر کمبل کورگ کو بھیجا جاتا ہے
بھیجے جاتے ہیں

کتابیات

۱- مقالات محمود — میر محمود حسین

۲- ریاست میسور کے عربی فارسی اور اردو کتبے — میر محمود حسین

۳- ریاست میسور میں اردو مثنوی کا ارتقاء — ڈاکٹر فہمیدہ بیگم

۴- فکر و ادب مثنوی نمبر — ڈاکٹر فہمیدہ بیگم

۵- میسور گزیٹیر ضلع ٹمکور — کے ابھیشان کر وغیرہ

۶- بہادر نامہ — مخطوطہ

۷- مقدمہ تاریخ دکن — عبدالمجید صدیقی

۸- تاریخ سلطنت خداداد — محمود خان بنگلوری

۹- حیدر علی — این کے سنہا

۱۰- ریاست میسور میں اردو جلد اول (حصہ اول و دوم) — ڈاکٹر آمنہ خاتون، محمد خاں

۱۱- فرامین — مخطوطات

۱۲- شجرے — مکانوں کی ملکیت

۱۳- تعلق آفس ریکارڈ

میونسپل ریکارڈ

URDU LIBRARY CENTRE